بیاد: حضرت الحاج حافظ عبدالستار صاحب عزیزیؒ

دینی، دعوتی، علمی، ادبی، تحقیقی، فکری اور اصلاحی ترجمان

ماهنامه

نقوش اسلام

Issue.No.7	صفر ۱۴۴۱ھ / October2019- اکتوبر ۲۰۱۹ء	VOL.No.14

مجلس سرپرستان

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
ولی مرتاض حضرت مولانا سید مکرم حسین سنسار پوری
شیخ طریقت حضرت مولانا قمر الزماں الہ آبادی
نمونۂ سلف حضرت مولانا سید محمد سلمان مظاہری

مجلس مشاورت

مولانا سید الرحمٰن اعظمی ندوی — مولانا بلال عبدالحئی حسنی ندوی
مولانا سید الرحمٰن فیضی ندوی — مولانا محمد اکرم ندوی
مولانا محمد عامر صدیقی ندوی — الحاج موسیٰ اسماعیل درسوت
مولانا محمد احمد صالح جی، — مولانا حسن مرچی
مولانا یحییٰ بام، مولانا رشید احمد ندوی، مولانا محمد منذر ندوی

مجلس ادارت

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی ❁ مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری ❁ مولانا حمید اللہ قاسمی کبیر نگری

چیف ایڈیٹر

محمد مسعود عزیزی ندوی

مدیر انتظامی

ڈاکٹر مرغوب عالم عزیزی

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

NUQOOSH-E- ISLAM
MUZAFFARABAD.SAHARANPUR.247129
(U.P)INDIA. Cell.09719831058
E.mail : nuqooshe_islam@yahoo.co.in
masoodazizi94@gmail.com
www. nuqoosheislam.com , www. mifiin.org
ماہنامہ ''نقوش اسلام'' مظفرآباد، سہارنپور 247129 (یوپی) انڈیا

شرح خریداری

ہندوستان کے لیے

فی شمارہ.................۲۰/روپئے
سالانہ......................۲۴۰/روپئے
خصوصی...... ......۵۰۰۰/روپئے
ایشیائی، یورپی افریقی و امریکی ممالک کے لیے ۵۰/ڈالر

رسالہ کے جملہ امور سے متعلق اس نمبر پر رابطہ کریں: **09719639955**

منیجر توسیع واشاعت: قاری محمد صالحین
Mob: 09813806392

Markazu Ihyail Fikril Islami , A/C No. 30416183580,S.B.I
Monthly Nuqoosh-e-Islam, A/C No. 30557882360,S.B.I

PRINTED, PUBLISHED AND OWNED: MD FURQAN
PRINTED AT LUXMI PRINTING PRESS SAHARANPUR
EDITOR: MD FURQAN

iles\A017.TI not found. Files\A025.TIF not found. iles\A017.TI not found.

اس شمارے میں

عناوین	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ		۳
حضرت مولانا یوسف متالا صاحبؒ	محمد مسعود عزیزی ندوی	
نیر تاباں		۷
انسانی تاریخ کی قدسی جماعت	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	
کارنامے		۱۱
مفکر اسلام کے تجدیدی......کی ایک جھلک	مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی	
صفات حمیدہ		۱۶
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حلم	مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی	
یاد رفتگاں		۱۸
حضرت مولانا افتخار الحسن صاحب کاندھلویؒ	مولانا محمد ارتضاء الحسن، قطر	
رہنمائے طلبہ		۲۷
طلبہ تحریک کے کامیاب تجربات	مولانا ڈاکٹر عبد الحمید اطہر ندوی	
تجزیہ		۳۲
ٹیپو سلطان کا ہندوؤں کیساتھ حسن سلوک	جناب موسی خان صاحب	
حسین یادیں		۳۴
آہ! مولانا عبد الواجد صاحب ندوی	حمید اللہ قاسمی کبیر نگری	
اصلاحیات		۳۶
مسجدوں کے آداب و مستحبات	محمد مسعود عزیزی ندوی	
جائزہ		۴۱
کیا ہے "صدی کی ڈیل"	تنویر احمد صاحب آفاقی	
طب یونانی		۴۵
موسم سرما کے امراض اور احتیاطی تدابیر	ڈاکٹر فرزانہ افضل، بنگلور	
نقوش صحابہ		۴۶
حضرت زید بن حارثہ......	مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری	

ماہنامہ "نقوش اسلام" کے لئے شرح اشتہار

ٹائٹل صفحہ آخر رنگین	(فل سائز)	۳۰۰۰............
// // اول اندرونی	// //	۲۵۰۰............
// // آخر اندرونی	// //	۲۰۰۰............
صفحہ اندرونی	(فل سائز)	۱۰۰۰............
آدھا صفحہ اندرونی		۶۰۰............
¼ صفحہ //		۴۰۰............

اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ اسی رسالہ کے ساتھ آپ کی سالانہ مدت خریداری پوری ہو رہی ہے، لہٰذا آئندہ کے لیے جلد ہی زر تعاون مبلغ ۲۴۰ روپئے ارسال فرمائیں، تاکہ رسالہ کو جاری رکھا جا سکے۔ (ادارہ)

نوٹ: شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں، ہر قسم کی چارہ جوئی کا حق صرف عدالت سہارنپور کو ہی ہوگا۔

پرنٹر پبلیشر: محمد فرقان نے لکشمی آفسیٹ پریس سہارنپور میں طبع کرا کے دفتر ماہنامہ نقوش اسلام مظفر آباد سے شائع کیا

کمپوزنگ: عزیزی کمپیوٹر سینٹر: مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد، سہارنپور، یوپی (الھند)

اداریہ

حضرت مولانا یوسف متالا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق اوران کی عنایات

محمد مسعود عزیزی ندوی

مولانا یوسف متالا کا نام تو بہت دنوں سے سنا ہوا تھا، البتہ ان سے دید وشنید ان کے بڑے بھائی حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب متالا (متوفی ۹ر دسمبر ۲۰۱۲ء) کے انتقال کے بعد ہوئی، جب حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب متالا کے حالات پر ماہنامہ ''نقوش اسلام'' کا جنوری/فروری ۲۰۱۳ء میں خصوصی شمارہ نکالا، اس وقت مولانا یوسف متالا سے فون پر بات ہوئی اور انہوں نے راقم کے نام خط کی شکل میں ایک مضمون لکھ کر بھیجا، جس میں حضرت مولانا عبدالرحیم متالا کی وفات کی تفصیل لکھی:

مکرم محترم مولانا مسعود عزیزی ندوی صاحب زید مجدکم - بعد سلام مسنون!

بھائی جان کے لئے اتوار کی صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد چائے لائی گئی، آدھا کپ نوش فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا وہیل چیئر لاؤ، اس پر بٹھایا گیا، فرمایا باہر لے چلو، چار قدم پر جب دروازہ کی دہلیز پر پہنچے، جب سامنے آسمان نظر آنے لگا، اشارے سے ٹھہرنے کو فرمایا۔

اس کے بعد آسمان کی طرف پوری گردن پیچھے کی طرف کر کے دیکھ کر اذان کی طرح نہایت بلند آواز سے فرمایا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' پھر اسی طرح گردن اور آنکھیں آسمان میں ادھر ادھر گھوم رہی ہیں، قدرے فاصلہ پر مسجد ہے، وہاں سے طلبہ اور اساتذہ سلام سن کر دوڑے بھاگے پہنچ کر سامنے جمع ہیں، مگر نگاہ آسمان کی طرف ہے، تقریباً دو منٹ یہی حال رہا، اس کے بعد گردن آہستہ آہستہ جھک گئی اور روح پرواز کر گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بھائی جان یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۳ھ بروز بدھ اس عالم آب وگل میں پہنچے تھے، اور ستر برس سات ماہ اور چوبیس دن دنیا میں گزار کر اتوار ۲۵ر محرم ۱۴۳۴ھ کو علی الصباح پانچ بج کر ۴۵ر منٹ پر واپس عالم بالا میں قدم رنجہ ہو گئے۔

وصال کا حال استاذ مکرم حضرت مولانا سید محمد عاقل صاحب دام ظلہم کے پوچھنے پر فون پر میں نے عرض کیا تو فرمانے لگے یہ تو آج بالکل انوکھا واقعہ معلوم ہوا، واقعہ بھی یہی ہے کہ راقم کی کتاب ''بزرگوں کے وصال کے احوال'' میں کوئی پانچ سو کے قریب آخرت کے سفر کرنے والوں کے واقعات ہیں، جو گذشتہ ماہ حضرت مفتی محمد فاروق صاحب میرٹھی دام مجدہم کے تقاضے پر دوبارہ طبع ہوئی، جس میں ذکر اللہ کرتے، کلام اللہ پڑھتے، حدثنا اخبرنا کے ساتھ حدیث سناتے ہوئے جانے والوں کا ذکر ہے، سجدہ میں جان دیدی، شعر پڑھتے پڑھتے یا سنتے ہوئے چلے گئے، یا چیخ ماری جان دیدی، الگ الگ ابواب ہیں، ایک خواب میں دیکھا، پوچھا کیا گزری؟ اس میں ہے کہ شیخ محمد بن الحسین نے کھڑے ہو کر فرمایا ''وعلیکم السلام'' آئیے، پوچھا گیا آہا! یہ آپ نے کس کو دیکھ کر فرمایا، جواب دیا شیخ ابوالحسن خرقانی وعدہ کی بناپر اتنے زمانہ بعد جوانمردوں کی جماعت لیکر آئے ہیں تاکہ میں نہ ڈروں، یہ فرما کر انتقال

فرما گئے، اللہ کرے بھائی جان ہمیں لینے کو آئیں۔ فقط والسلام

۱۹؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ   یوسف متالا

❁❁❁❁❁——————❁❁❁❁❁

اس کے بعد جب ''نقوش اسلام'' کے مضامین کو مستقل کتابی شکل میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا، تو اس پر پیش لفظ کے طور پر بھی ایک تحریر لکھی اور ایک ہزار نسخے خریدنے کا وعدہ کیا، پھر جن میں سے پانچ سو نسخے حضرت مولانا طلحہ صاحب کو دلوائے، باقی نسخے مولانا کو یوکے بھیجے، اس کے بعد ان سے تعلق میں مزید اضافہ ہوتا گیا، پھر وہ ایک عرصے کے بعد سہارنپور حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب سے ملاقات کیلئے آئے تو ان سے بالمشافہ پہلی ملاقات سہارنپور میں ہوئی، اس کے بعد ان کا تعلق ایسا بڑھا کہ وہ بعض مرتبہ دن میں کئی کئی مرتبہ فون کرتے اور سکون حاصل کرتے، میں فون پر ان کو حضرت کہہ کر مخاطب کرتا، وہ کہتے کہ نہیں دوستوں کی طرح بات کرو اور فرماتے کہ مجھے آپ سے بات کر کے سکون مل جاتا ہے، اس طرح ان کو جب بھی ذہنی طور پر کوئی پریشانی یا گھبراہٹ ہوتی تو وہ فون کرتے اور سکون حاصل کرتے اور جب حضرت مولانا طلحہ صاحب کو کوئی پیغام دینا چاہتے، تو مجھے فون کر کے مجھ سے کہتے اور میں وہ پیغام حضرت مولانا طلحہ صاحب تک پہنچاتا، بہت سی ایسی باتیں ہیں جن میں بعض مرتبہ پیر صاحب کو بھی عجیب سا لگا کہ آپ کے ذریعہ کیوں پہنچاتے ہیں، ایک مرتبہ پیر صاحب کے خطوط جو مولانا عبدالرحیم متالا کے نام تھے، ان کو مولانا یوسف متالا نے کمپوز کرا کے کتابی شکل میں بنا کر مجھے ۱۹؍مئی ۲۰۱۳ء کو ای میل سے بھجوایا، خطوط کی یہ فائل ابھی بھی میرے ای میل پر موجود ہے اور ساتھ میں یہ خط بھی تحریر کرایا، جو حضرت کے ایک خادم مولانا ابراہیم امین (حال مقیم آکسفورڈ) نے لکھا تھا، خط مندرجہ ذیل ہے:

مولانا محمد مسعود صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے، منسلک فائل میں حضرت پیر صاحب کے وہ خطوط ہیں، جو انہوں نے حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب متالا کو تحریر فرمائے تھے، ہمارے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے حضرت پیر صاحب سے اجازت چاہی تھی کہ ہم آپ کو یہ فائل بھیج دیں، تاکہ آپ اس کو پرنٹ کر کے ان کی خدمت میں پیش فرمادیں، حضرت پیر صاحب نے اجازت مرحمت فرمادی، اس لئے ای میل کی جارہی ہے، برائے کرم اس کا پرنٹ آؤٹ حضرت پیر صاحب کی خدمت میں پہنچادیں، تاکہ حضرت پیر صاحب اسے سن لیں اور اصلاح فرما کر واپس ہمیں بھیج دیں، جزاک اللہ، انشاء اللہ فون پر بھی رابطہ کی کوشش کروں گا۔ والسلام

ابراہیم امین

❁❁❁❁❁——————❁❁❁❁❁

اور پھر معلوم کرنا چاہا کہ پیر صاحب ان کو دیکھ لیں، اگر وہ اجازت دیں گے تو ان کو شائع کیا جائے گا، تو راقم نے وہ پیر صاحب کو جا کر دئے، اس وقت بھی پیر صاحب کو عجیب سا لگا؛ لیکن چونکہ ان کو تعلق بہت زیادہ ہو گیا تھا اور پہلے سے پیر صاحب سے اجازت لے چکے تھے، جیسا کہ خط کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ان کو سکون و راحت ملتی تھی، اس لئے وہ خوب باتیں کرتے تھے، بلکہ بات کرنے کے بہانے تلاش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ انکے درجات بلند فرمائے، عجیب سا ان کو تعلق اور محبت ہو گئی تھی، انہوں نے سردی کے لئے جرسی وغیرہ بھی دو تین مرتبہ بھیجی اور اپنی تمام تصنیفات بھی بھجوائیں۔

پھر انہوں نے اپنا قرآن کریم کا ترجمہ ''اضواء البیان'' بھی راقم کے ذریعہ چھپوایا اور ترجمہ کے شروع میں حضرت مولانا عبدالرحیم متالا پر تفصیل سے جو مضمون ہے وہ بھی راقم سے لکھوایا، جو اضواء البیان کے تمام ایڈیشنوں میں شامل ہے، اس طرح اضواء البیان دس ہزار کی تعداد میں اردو میں شائع کرا کے مدارس میں تقسیم کیا، پھر اس کا ہندی ترجمہ اور اس کے بعد گجراتی ترجمہ شائع کیا، اس سلسلہ میں ان کی طرف سے ای میل اور سی ڈی کے ذریعہ سے جو مواد ملتا رہا، اس کو شاداب بھائی ''اتحاد بک ڈپو'' دیوبند والوں کے حوالہ کیا جاتا رہا، پیسے کا لین دین شاداب بھائی سے حضرت کے آدمی مولانا اسماعیل گنگات صاحب براہ راست کرتے رہے، اس طرح اضواء البیان شائع کر کے ہندوستان کے مختلف مدارس اور مقامات میں تقسیم کی گئی، ان کے اس تعلق اور محبت میں شاید بعض لوگوں نے رخنہ ڈالنے کی بھی کوشش کی تا کہ وہ بدظن ہو جائیں حالانکہ ان سے کبھی مادی فائدہ نہ اٹھایا گیا، نہ اٹھانے کی کوشش کی گئی، للہ فی اللہ ان سے تعلق تھا، جس کا راقم بھی اظہار کرتا تھا اور وہ خود بھی اس کو محسوس کرتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا بہت منجھے ہوئے ہوشیار آدمی تھے، تمام نشیب و فراز سے واقف تھے۔

فون پر راقم کی کھانسی وانسی کا ان کو احساس ہوا تو انہوں نے بتلایا کہ یہ عارضہ مجھے بھی تھا، پھر انہوں نے ایک کتاب بتلائی کہ وہ فلاں ڈاکٹر کی لکھی ہوئی ہے، اس کے مطابق اپنے خون کا گریڈ چیک کراؤ، پھر جس گریڈ کا خون ہو، اس کتاب میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ اگر اس گریڈ کا خون ہے تو یہ چیزیں کھانی ہیں یہ چیزیں نہیں کھانی ہیں، مجھے تو اس سے فائدہ ہوا، اس کے بعد انہوں نے واٹس اپ کے متعلق بتلایا، چونکہ اس وقت ہندوستان میں واٹس اپ نہیں تھا، انہوں نے ہی بتلایا کہ ایسا فون لو، جس میں واٹس اپ چلے، چنانچہ اس طرح کا فون لے لیا گیا، پھر کچھ دنوں کے بعد یہ واٹس اپ اتنا عام ہو گیا کہ ہر آدمی استعمال کرنے لگا، اس وقت یہاں شہر سہارنپور میں بڑی بڑی دکان والے بھی واقف نہیں تھے، بہر حال چونکہ مولانا کچھ چیزیں بھیجنا چاہتے تھے، اس سے سہولت ہو گئی تھی، وہ اپنے پروگرام بھی روزانہ بتلاتے تھے کہ آج ہمارے یہاں روزہ ہے، آج فلاں پروگرام ہے، آج قرآن کریم کا ختم ہے، وغیرہ وغیرہ، ایک مرتبہ راقم کے ادارے کیلئے حضرت مولانا عبدالرحیم متالا کے ایک مرید جو رقم اکھٹی کرتے تھے، ان کو کسی نے بدظن کر دیا، انہوں نے وہ رقم روک لی اور مولانا یوسف صاحب متالا سے رابطہ کر کے پوچھنا چاہا تو مولانا یوسف صاحب نے کہا کہ بلا جھجھک ان کی رقم پہنچائی جائے اور کسی بدگمانی کی ضرورت نہیں اور جب تک میں زندہ ہوں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں، چنانچہ پھر انہوں نے وہ رقم بھیجی اور مولانا یوسف صاحب کی یہ بات بھی بتلائی۔

ایک مرتبہ راقم رمضان شریف میں چیپاٹا زامبیا میں تھا، مولانا کو معلوم ہوا، تو مولوی ایوب اگرادا کے ذریعہ سے اپنے بھائی مولانا حسن بورات جو جنوبی افریقہ کے شہر میڈل برگ میں مقیم تھے، ان سے رابطہ کرایا، ان سے تعارف کرایا، ان کو اپنی فیملی کا ممبر بتا کے تعارف کرایا، پھر جب راقم کچھ دنوں کے بعد جنوبی افریقہ کے سفر پر گیا تو ان کے بھائی حضرت مولانا حسن بورات صاحب (جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے خلیفہ تھے، وہ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت رائے پوری کی خانقاہ میں چالیس دن قیام پذیر رہے تھے، اس کے بعد حضرت رائے پوری نے خلافت سے نوازا تھا)

نے بھرپور استقبال کیا، شہر میں مختلف لوگوں سے ملاقات کرائی اور سب سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ یہ ہمارے فیملی ممبر ہیں، پھر مولانا یوسف صاحب نے دربن میں اپنی بہن مریم کو فون کیا، مریم بہن نے دعوت کی، گھر پر بلایا اور وہ اس طرح خوش ہوئی، جس طرح کوئی اپنے بھائی سے مل کر خوش ہوتا ہے، اس طرح مولانا یوسف صاحب نے اسٹینگر شہر میں اپنے بھائی شبیر بھورات کو فون کر دیا، ان کو بھی یہی کہہ کر تعارف کرایا کہ ہمارے فیملی ممبر ہیں، انہوں نے بھی مختلف حضرات سے ملاقات کرائی اور سب کو اپنا فیملی ممبر کہہ کر تعارف کرایا، بہرحال مولانا بہت شفیق تھے اور جس سے تعلق ہوجاتا، اس کو خوب نبھاتے تھے۔

❁❁❁❁❁ ———— ❁❁❁❁❁

اکتوبر ۲۰۱۷ء میں راقم یوکے کے سفر پر تھا، تو ۴ر اکتوبر کو ان کے شہر بلیک برن جانا ہوا، ان کو اطلاع دی، شام کو ۵ر بجے کے بعد مولانا کے گھر پہنچا، راقم کے ساتھ حافظ عبدالرحیم ملا تھے، مولانا نے چائے وغیرہ پلائی، طبیعت میں نشاط نہیں تھا، بارش ہورہی تھی، اور شاید مولانا کو سردی لگ رہی تھی، بہرحال مولانا نے ہندوستان کے کئی علماء کے لئے جرسیاں دیں (جو اگرچہ نہ پہنچ سکیں چونکہ فلائٹ میں بیگ نہ آسکا) اب کی بار جولائی ۲۰۱۹ء میں راقم یوکے گیا تو مولانا سے ملاقات نہ ہوسکی، جس کا مجھے بھی احساس رہا، مولانا کو بھی اطلاع ہوگئی تھی، اس لئے انہوں نے ابھی اپنے کناڈا کے آخری سفر میں مولانا سعیدالرحمٰن فیضی ندوی سے تذکرہ کیا کہ مولانا تشریف تو لائے تھے مگر ملاقات نہ ہوسکی، بہرحال مولانا نے یوکے میں بڑا دارالعلوم قائم کیا، جس سے وہاں بڑا فیض ہوا، ان کی حیات میں راقم نے ''تصوف اور اکابر دیوبند'' نامی اپنی کتاب میں جو مضمون لکھا تھا وہ یہاں نقل کیا جارہا ہے:

''حضرت مولانا محمد یوسف صاحب متالا نانی نرولی ضلع سورت گجرات میں یکم محرم الحرام ۱۳۶۶ھ م ۲۵ر نومبر ۱۹۴۶ء بروز پیر پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، پھر جامعہ حسینیہ راندیر میں پڑھا، تعلیم کی تکمیل جامعہ مظاہر علوم میں ہوئی، اسی زمانے میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا، اور سلوک وطریقت کے منازل طے کئے، حضرت شیخ کی طرف سے مجاز بیعت قرار پائے اور حضرت شیخ کا بھرپور اعتماد حاصل کیا، اور پھر انگلینڈ جا کر ایک بڑا دارالعلوم قائم کیا، جہاں سے علم ظاہری وعلم باطنی کی سیرابی کا عمل بھی شروع کیا، اس وقت آپ کا ادارہ برطانیہ کے ممتاز اداروں میں شمار ہوتا ہے، آپ اس وقت شیخ برطانیہ ہی نہیں بلکہ شیخ یورپ ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ کی صحبت وتعلق کی برکت سے آپ کو بلند ترین مقام عطا کیا، اس طرح آپ کا فیض انگلینڈ اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں پھیل رہا ہے، ایک خلق کثیر آپ سے فیضیاب ہورہی ہے، متعدد تصنیفات آپ کے حسنات میں شامل ہیں، اور آپ کی زندگی کا عظیم کارنامہ قرآن شریف کا عام فہم زبان میں ترجمہ ہے، جو ''اضواء البیان'' کے نام سے اردو، ہندی اور گجراتی میں شائع ہوکر مقبول ہوچکا ہے''۔

❁❁❁❁❁ ———— ❁❁❁❁❁

ابھی وہ گزشتہ ماہ کناڈا کے دعوتی سفر پر تھے کہ اچانک ان کو قلب کا عارضہ ہوا، اور پھر وہ دو ہفتے کے قریب ہوسپٹل میں داخل رہے، بالآخر ۱۰ر محرم ۱۴۴۱ھ م ۱۰ر ستمبر ۲۰۱۹ء کو ان کا انتقال ہوگیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے درجات کو بلند فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور ہمیں اپنے پاک لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نیّر تاباں

انسانی تاریخ کی قدسی جماعت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت انسانی تاریخ میں اپنی ایمانی کمیت اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے منفرد جماعت گزری ہے، اس کو اللہ تعالی کے آخری اور مثالی شخصیت رکھنے والے نبی نے اس طرح تربیت دی کہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایمان رچ بس گیا تھا، اور یاد الٰہی کی وہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی کہ فرشتوں جیسے اعمال ظاہر ہوتے تھے؛ لیکن انسان کو اس کے پروردگار کی طرف سے دنیا اور دین کے درمیان جامعیت اور دنیاوی امور میں اپنی پسند کو تابع بنانے اور تابع نہ بنانے کی جو صلاحیت دی گئی ہے، وہ صلاحیت فرشتوں کو نہیں دی گئی ہے، اسی طرح انسانوں کو امتحان سے گزارا گیا اور تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں انسانوں کو اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کی طرف برابر توجہ دلائی گئی اور اس کامیابی میں بڑے انعام واکرام کا وعدہ فرمایا گیا، توجہ دہانی کا یہ کام انبیاء علیہم السلام برابر کرتے رہے، آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو تلقین کی اور ان کی ایسی تربیت کی کہ اس امتحان میں انہوں نے کامیابی کی مثال قائم کردی اور یہ سب اللہ تعالی کے حکم وارادہ سے ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الرسل اور تمام اہل ایمان کے لئے اسوۂ حسنہ بنائے جانے کا نتیجہ اور علامت بنا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ میں محنت کامیاب اور وسیع اثر رکھنے والی نہ ہوتی تو آپ خاتم الرسل اور اسوۂ حسنہ کیسے قرار دیئے جاتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید وایمان کی دعوت اس طریقہ سے دی کہ جس نے بھی توجہ سے سنا بات اس کے دل میں اتر گئی اور اس پر اس کا ایمان مستحکم ہوگیا، آپ کا اخلاقی، انسانی ہمدردی اور محبت بھرا انداز بھی ایسا تھا کہ جس نے بھی قریب سے دیکھا اور سنا وہ صرف متأثر ہی نہیں ہوا بلکہ دل وجان سے آپ کا کہنا ماننے والا بن گیا اور آپ پر فدا ہونے کیلئے تیار ہوگیا اور یہ حالت صرف دو چار آدمیوں کی نہیں ہوئی، بلکہ جس نے بھی آپ کو دیکھا سنا اور سمجھا اس کی یہی کیفیت ہوگئی، اس طرح آپ کی دعوتی زندگی کی ۲۳؍سالہ مدت میں ایمان والوں کی ایسی جماعت تیار ہوگئی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، یہی آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپکی پوری نیابت کرنیوالی بن گئی، اس پر اس کام کو چلاتے رہنے کی ذمہ داری ڈالی گئی اور اس ذمہ داری کو اس نے پوری دیانت وامانت اور مکمل توجہ سے انجام دیا، اسکے سامنے اللہ کی خوشنودی اور حضور کی محبت اور آخرت کا مسئلہ تھا جس کو ان لوگوں نے دل وجان سے قبول کیا تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو بھی ایمان لاتا خواہ امیر ہوتا یا غریب، معزز خاندان کا ہوتا یا کمزور پوزیشن کا، اس میں ایسا ہی پختہ ایمان پیدا ہوجاتا۔

یہ ایمان زیادہ تر دو اسباب سے پیدا ہوتا تھا، ایک سبب اللہ تعالی کا کلام معجز بیان تھا جس کو ایک بار بھی سن لینے سے آدمی کا دل بدل جاتا تھا، دوسرا سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وشفقت کو قریب سے دیکھ لینا تھا، قرآن مجید سن کر ایمان لانے والوں کی تعداد بھی خاصی تھی، آپ کے اخلاق وبات چیت سن کر متأثر ہونے والوں کی تعداد بھی خاصی تھی، آپ سے متأثر ہونے کی ایک مثال ثمامہ بن اثال کا واقعہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دشمنی بلکہ آپ کو نقصان پہنچانے کی نیت سے آئے؛ لیکن ملتے ہی بدل گئے اور کہنے لگے کہ یارسول اللہ! قسم ہے خدا کی کہ سارے عالم میں مجھ کو آپ سے

زیادہ کسی اور سے اتنی نفرت نہ تھی؛ لیکن اب تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی دنیا میں سب سے بڑھ کر پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ (صحیح مسلم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کا حال آپ کی محبت اور تربیت سے ایسا ہی بن گیا کہ ان کے دلوں میں ایمان لاتے ہی اس طرح کی محبت اور فدائیت کی کیفیت پیدا ہوجاتی اور پھر آپ کی رہنمائی اور تعلیم وتلقین سے زندگی کے اعلیٰ حقائق سے واقفیت اس درجہ پیدا ہوجاتی کہ ان کو دین کی نصرت اور اپنے رب کیلئے فدائیت میں اعلیٰ مقصد کیلئے جانثار کردینے میں ادنی تکلف نہ ہوتا اور اپنے معلم اور قائد نبی مکرم کے حکم پر بے تکلف اپنی جان نثار کردینے کیلئے تیار ہو جاتے، اپنی مرضی اور خواہش میں خواہ کتنا سخت رہے ہوں آپ کی مرضی کے سامنے اس کو بالکل نظر انداز کردیتے اور آپ کی مرضی کے مطابق عمل کرتے، چنانچہ جو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اس نے اسی بات کا ثبوت دیا، اس کی ایک بڑی مثال صلح حدیبیہ میں صحابہ کرام کا قریش کی ظالمانہ شرائط کا قبول کرلینا اور آپ کی مرضی کے سامنے جھک جانا ہے اور غزوۂ خندق میں ۳؍ہفتوں سے زیادہ فقر وفاقہ اور سخت سردی کی حالت میں اپنی جان ہتھیلی پر لئے جمے رہنا ہے، اور غزوۂ احد میں جب دشمن شکست کھا کر بھاگنے لگے اور یہ دیکھ کر پہاڑی پر مقرر حفاظتی دستہ کے افراد میں سے اکثر نیچے اتر آئے اور دشمن نے موقع مناسب سمجھ کر پلٹ کر حملہ کردیا اور مسلمان فوج منتشر ہونے لگی اور تھوڑے وقت کے لئے افراتفری کی صورت بن گئی تو آپ کے گرد حضرت ابوبکر وحضرت عمر جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جم کر مقابلہ کرنے لگے اور آپ کو دشمن سے بچانے کے لئے دسیوں جانثار صحابہ آپ کے سامنے آگئے اور دشمنوں کے وار اپنے سینوں پر لئے اور سارے زخم برداشت کئے، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہیں اور آپ پر قربان ہوگئے، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ سامنے کردیا اور تیروں کو روکنا شروع کیا، یہاں تک ان کی سب انگلیاں زخموں سے لہولہان ہوگئیں اور ہاتھ مفلوج ہوگیا، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے خود کی ایک کڑی کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر نکالا تو اسی کے ساتھ ان کا ایک دانت بھی گر پڑا، دوسری کڑی نکالی تو دوسرا دانت بھی اس کے ساتھ باہر آگیا، حضرت ابودجانہ ڈھال بن کر آپ کے سامنے کھڑے ہوگئے، تیر ان پر گرتے رہے؛ لیکن وہ اسی طرح آپ پر جھکے رہے، یہاں تک ان کی پیٹھ تیروں سے چھلنی ہوگئی۔ (سیرت ابن ہشام جلد۲؍صفحہ ۴۱۷)

غزوۂ احد کے بعد مسلمان مدینہ پہنچے تو راستہ میں بنی دینار کی ایک خاتون کے مکان پر ان کا گزر ہوا، جس کے باپ، بھائی اور شوہر سب اس معرکہ میں کام آگئے تھے، باری باری تین حادثوں کے صدا ان کے کانوں میں پڑی تھی؛ لیکن وہ ہر بار صرف یہ پوچھتی تھیں کہ رسول اللہ کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا: بخیر ہیں، انہوں نے پاس آکر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھیں: ’’كل مصيبة بعدك جلل‘‘ آپ کے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔

جب کفار قریش زید بن الدثنہ کو قتل کرنے کے لئے حرم سے باہر لائے تو ابوسفیان نے ان سے کہا کہ زید میں تم سے قسم دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم یہ پسند کروگے کہ تم آرام سے اپنے گھر والوں میں ہو اور تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں؟ زید نے جواب دیا کہ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں آرام سے ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کانٹا بھی چبھے ابوسفیان نے اس پر کہا کہ میں نے کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محبت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی کرتے ہیں، جو شخص بھی چند منٹ کے لئے ایمان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا وہ آپ پر سب کچھ قربان کردینے کیلئے تیار ہو جاتا، سوائے ان بعض لوگوں کے جو مدینہ میں بسے یہودیوں کے دوست ہونے کی بنا پر بطور سازش اپنے کو مسلمان دکھانے کو اختیار کیا اور منافقین کے زمرہ میں شامل ہوگئے، وہ اپنے دوستوں اور یہودیوں کے پاس جاکر اپنی اصلی حالت کے مطابق کفر کی باتیں کرتے اور مسلمانوں کے سامنے ظاہر میں اپنے کو مسلمان

دکھاتے اور جہاد میں جانے کا موقع آ تا تو کوئی صورت بہانے کر کے اپنے کو خطرہ میں پڑنے سے بچالیتے، وہ اپنی اسی حرکت کی بنا پر منافق کی حیثیت سے پہچان لئے جاتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے ان کے نام بھی بتادئے گئے تھے؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کارروائی اس لئے نہیں کی کہ غیروں کی نظر میں آپ کے عمل کے بارے میں بدگمانی نہ ہو، کیونکہ وہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان بتاتے تھے ورنہ مکہ سے آئے ہوئے اور مدینہ منورہ کے بقیہ سب لوگ آپ پر فدا تھے اور ہر حکم کو بغیر کسی چوں چرا قبول کرتے تھے اور جو منافق تھے ان کی طرف سے خطرہ کے موقع پر بہانہ بازی اختیار کرتے رہنے سے وہ عام طور پر سب کی نگاہوں میں آ گئے تھے، قرآن مجید میں ان کی نشاندہی بھی کردی گئی تھی اور ایمان وعزیمت والوں کا ذکر قرآن مجید میں بہت اعلی اسلوب میں کیا گیا: "مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيماً"۔ (سورۂ فتح آیت ۲۹)

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحمدل ہیں، تو انہیں دیکھا کہ رکوع اور سجدہ کررہے ہیں، اللہ تعالی کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں، ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے، ان کی یہی مثال توریت میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے، مثل اس کھیتی کے جس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہوگیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہوگیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تا کہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑائے، ان ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ تعالی نے بخشش کا اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور صحبت سے صحابہ کرام کی جو جماعت بنی وہ ایمان اور محبت رسول اور آپ کے لائے ہوئے دین اسلام کی پیروی میں ناقابل تسخیر پہاڑ کی طرح تھی اور بتدریج اتنی بڑی تعداد میں یہ جماعت تیار ہوئی کہ تاریخ انسانی میں صالح ترین اور پختہ ایمان اور دین میں پختگی رکھنے والی اتنی بڑی جماعت ہونے کی مثال نہیں ملتی اور یہ دراصل اللہ تعالی کی طرف سے تھا، جس نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کے بعد کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں اور آپ کی صحبت اور رہنمائی حاصل کرنے والوں کی جماعت کو ایسے صفات اور کردار کا بنادیا کہ وہ نبوت کی پوری نیابت کرتے ہوئے اس دین کو اور اعلی انسانی صفات کو آگے بڑھائیں، اس کے افراد میں سے ہر ایک اپنی جگہ آفتاب وماہتاب تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں تصدیق بھی کی، فرمایا: "اصحابی کالنجوم بأیهم اقتدیتم اهتدیتم" یعنی میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں، ان میں سے جس کی اتباع کروگے ہدایت پر رہوگے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو جتنا زیادہ قریب رہا اس کو اتنی زیادہ اولیت حاصل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ رہے کہ جن سے آپ کی رفاقت اور دوستی نبوت سے پہلے سے تھی، وہ تقریباً آپ کے ہم عمر تھے، صرف دو ڈھائی سال چھوٹے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس دین اسلام کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کی ذمہ داری سب سے پہلے آپ کو ملی اور آپ خلیفہ اول ہوئے، پھر اسی ترتیب سے آپ کے بعد تین دیگر خلفاء ہوئے جو آپ کے سچے جانشین ہوئے اور خلفائے راشدین کہلائے، ان سب کے ذریعہ خلافت راشدہ یعنی اعلی معیار کی خلافت کا سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ۳۰ / سال تک جاری رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے ذریعہ جو اخلاق وصفات اور زندگی کی مختلف ذمہ داریوں میں جو طریقہ عمل اختیار کیا تھا اور اپنے صحابہ کو اس کی تربیت دی تھی اس

کے مطابق اسلامی دستور حیات کو صحابہ کرام کے ذریعہ بے کم وکاست جاری کیا جاتا رہا جس کے ذریعہ آئندہ کے لئے اعلی نظیر بن گئی اور دین صحیح کا راستہ روز روشن کی طرح مقرر ہوگیا اور بعد میں آنیوالوں کے لئے نمونہ اور اسوہ بن گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳/ سالہ تربیت وہدایات کے بعد آپؐ کے معتمد ترین اصحاب کے پاس ۳۰/سال تک اس ذمہ داری کے رہنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اختیار کردہ طریقہ عمل کے عین مطابق کام انجام پائے اور آئندہ کے لئے نمونہ بنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد ترین خلفاء کے نظام وانصرام کی یہ ۳۰/ سال کی مدت ایسی مدت تھی کہ اس کے اختتام پر نظم وانتظام سنبھالنے کا کام نئی نسل تک بتدریج منتقل ہوا جس کو براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی نہیں ملی تھی؛ لیکن عین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اختیار کردہ طریقہ کی طرح تھی اور یہ دراصل اللہ تعالی کی طرف سے ہی انتظام تھا وہ یہ کہ آپ کی نبوت کے آخری دس سال وحی الہی کی روشنی میں اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی میں، پھر تیس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ حضرات کے تحت نمونہ کا نظام اسلامی چلے، اس طرح چالیس سال میں دین اسلام کے نمونہ کا نظام اسلامی سامنے آجائے اور قیامت تک وہ معیاری نمونہ کے طور پر سامنے رہے کیونکہ دین مکمل کردیا گیا اور اسی مکمل دین کو جاری رکھنا ہے اور قیامت تک انسانوں کی صلاح وفلاح کے لئے وہ بالکل کافی ہے، اس لئے کہ وہ اللہ رب العالمین کی طرف سے قیامت تک کیلئے دیا ہوا دین ہے، جو انسانوں کے مزاج اور ضرورتوں کو شروع سے آخر تک جاننے والا بلکہ بتانے والا ہے، اسی لحاظ سے اس کو مکمل فرمادیا گیا اور اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرمادیا گیا: ”إنا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون“ بیشک یہ کتاب ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ”الیوم أکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا“ آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر مکمل کردیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن حضرات کو یہ سلسلہ چلانا تھا وہ آپ کے اصحاب کی یہی جماعت تھی جن کو صحابت الرسول کا نام ملا، اسی جماعت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چالیس سال تک مثالی نمونہ کے طور پر آسمانی شریعت انسانوں میں نافذ کیا، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کو اچھی طرح سمجھا تھا، اور وہ اس کے لئے اپنی مرضی اور خواہشات کو مٹا چکے تھے اور اپنے نبی کا آئینہ بن چکے تھے وہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے اور نہ کرسکتے تھے، جو اللہ کے رسول کی مرضی کے خلاف ہو، یہ جماعت جماعت صحابہ کہلائی جن کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہوئی۔

رب العالمین کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مسلمانوں کو عطا کردہ جو شریعت ہے اور زندگی کی صلاح وفلاح کیلئے جو احکام ہیں وہ ہم کو صحابہ کرام کے توسط سے ہی ملے ہیں، صحابہ کرام کا ایمان وتقوی اتنا عظیم اور محکم تھا کہ اللہ رب العالمین کی طرف سے اپنے دین کو بے کم وکاست پہنچانے اور کمال دیانت داری کے ساتھ آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کیلئے حضرات صحابہ کو ذریعہ بنایا گیا، اس طرح شریعت اسلامی اور دین متین جو ہم کو پہنچا اس کی صحت وحقانیت کو اعتبار واعتماد صحابہ کی امانت ودیانت ہی سے حاصل ہوا، اور یہ اعتماد رب العالمین کی طرف سے صحابہ کرام کو اس دین متین کے احکام وتفصیلات کو بیان کرنے کیلئے اختیار کرنے سے بنا اور خاتم الرسل سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس جماعت کو جو محبت وعقیدت اور وابستگی تھی، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کے ساتھ ان حضرات سے بھی محبت کرنے کو ضروری بنادیا، اس طرح صحابہ کرام بھی ہمارے مطاع اور مقتدا بنے۔

کارنامے

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے

تجدیدی کارناموں کی ایک جھلک

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نائب ایڈیٹر پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو جن گونا گوں کمالات، خصوصیات وامتیازات سے نوازا تھا، ان میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کو اپنی زندگی میں ہی اپنی اصلاحی وتجدیدی علمی وفکری خدمات کی روشنی چاردانگ عالم میں پھیلتی دکھائی دی، اس کے گہرے اثرات ونتائج صرف اپنے ملک وخطہ میں ہی نہیں بلاد عربیہ میں خاص طور پر اور دنیا کے مختلف حصوں میں عام طور پر خود بھی محسوس کئے اور دنیا نے اس حقیقت کو بلانزاع تسلیم کیا، جب ان کا سانحۂ ارتحال صدی کے بالکل اختتام ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء بلکہ سن دو ہزار کے اختتام پر پیش آیا اور دنیا کے مختلف حصوں سے ان کیلئے دعاؤں کے اہتمام اور ان کے فکر ودعوت کے زمانہ کے حالات کا اعتبار کرتے ہوئے سب سے اہم اور مؤثر سمجھے جانے اور ان کے مشق سے عمومی وابستگی کے رجحانات کی اطلاع موصول ہوتی رہیں اور اس کے اثرات کو اور زیادہ وسعت دینے کیلئے موئمرات وندوات کا انعقاد اور اداروں ومراکز کا قیام جگہ جگہ ہونے لگا۔

بلاشبہ شخصیات ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور جس دور کی جو ضرورت اور جو تقاضہ سامنے آیا اس کے مطابق ان کی خدمات اور کارنامے سامنے آئے جس سے توحید ورسالت کے سلسلہ میں متزلزل ہو رہے ایمان ویقین کو مضبوط کرنے کا کام اپنے اپنے وقت میں ان شخصیتوں نے انجام دیا، دائرۂ عمل کسی کا محدود رہا، اور کسی کا مختلف میدانوں میں سامنے آیا، اسی طرح زمانی ومکانی فرق کے ساتھ نتائج وثمرات ظاہر ہوئے، ان شخصیتوں میں بھی وہ شخصیتیں جن کا کام زیادہ قوت وصراحت اور زیادہ وسعت وگہرائی کے ساتھ سامنے آیا اور عالمی طور پر اس کے اثرات آج بھی محسوس کئے جارہے ہیں (ائمہ اربعہ کا استثناء کرتے ہوئے) چار بڑے اہم افراد ایسے ہیں جن کے سایہ سے نکلا نہیں جاسکتا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام احمد سرہندیؒ مجدد الف ثانی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو اور پھر تیرھویں صدی ہجری میں امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کو اور چودھویں صدی ہجری میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ سے الگ الگ میدان میں جو تجدیدی واصلاحی کام لیا اس کے اثرات آج بھی تازہ ہیں اور پندرہویں صدی ہجری کے اوائل میں جو شخصیت پورے عالم اسلام میں اپنی دعوت وفکر میں ایک الگ شان اور انفرادیت کے ساتھ تن تنہا نظر آتی ہے کہ جس نے پوری قوت کے ساتھ اسلام پر اعتماد بحال کرنے اور اس کی انفعیت واصلحیت پر یقین مضبوط کرانے کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ذات گرامی ہے، جن کی خدمات اور کارناموں کا بڑا حصہ چودھویں صدی کی آخری تین دہائیاں رہیں، مگر ان کی تکمیل پندرہویں صدی ہجری کی آخری دو دہائیوں میں ہوئی۔

حضرت مولانا سیدابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ایک طرف مغربی فکر وفلسفہ کا گہرائی سے مطالعہ کرکے ان کی تھیوری کو کھوکھلا ثابت کیا اوران کے مفکرین وفلاسفر کے خوشہ چینوں پر یہ واضح کیا کہ یہ تھیوری انسانیت سے متصادم ہے، دنیا کی بقا کا رازاسی میں مضمر ہے کہ وہ اسلام کو اختیار کرے، اسی طرح نبوت محمدی کی ابدیت وصداقت اوراسی سے مسلمانوں کی عزت وعظمت کو اس قوت سے اس وقت باورکرایا کہ اب اس سے تعلق منقطع کرنے کی کوشش بزورطاقت ہورہی تھیں، اس موقع پرحضرت مجددالف ثانی کا وہ تجدیدی کارنامہ یادآتا ہے جوانہوں نے اکبر کے نظریہ وحدت ادیان کے خلاف کمربستہ ہوکر ذہن سازی، صبرواستقامت کے ساتھ انجام دیا تھا، جس کوحضرت مولانا سیدابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ ’’حقیقت میں ان کا اصل کارنامہ جس کا جلومیں انکے سارے تجدیدی کارنامے چلتے پھرتے نظرآتے ہیں اوران کی تجدید کا اصل سرچشمہ جس سے ان کے تمام انقلابی واصلاحی کاموں کے چشمے پھوٹتے ہیں، اوردریابن کر سارے عالم میں رواں دواں ہوجاتے ہیں، وہ نبوت محمدی اوراس کی ابدیت وضرورت پرامت کا اعتماد بحال کرنے اور مستحکم کرنے کا وہ تجدیدی وانقلابی کارنامہ ہے جوان سے پہلے اس تفصیلی وضاحت، قوت کے ساتھ ہمارے علم میں کسی مجددنے انجام نہیں دیا۔

اس تجدیدی اقدام سے ان تمام فتنوں کا سد باب ہوتا ہے جواس وقت عالم اسلام میں منھ پھیلائے ہوئے اسلام کے شجرۂ طیبہ اوراس کے پورے اعتقادی فکری اور روحانی نظام کونگل لینے کیلئے تیار تھے، ان میں ایران کی نقطوی تحریک اوراس کے پیروبھی شامل ہیں، جنہوں نے نبوت محمدی اوراس کے بقاء ودوام کے خلاف کھلےطریقہ پرعلم بغاوت بلند کیا تھا، ان فتنوں میں اکبر کا دین الٰہی اورآئین جدید بھی شامل ہے، جو ہندوستان میں نبوت وشریعت محمدی کی جگہ لینے اوراس کا بدل بننے کا مدعی تھا، اس سلسلہ میں وحدۃ الوجود کا فلسفہ بھی آتا ہے جواپنے داعیوں اورعلمبرداروں کے بقول کشفی حقائق پرمبنی تھا، اس ضمن میں فرقۂ امامیہ کا گروہ بھی آتا ہے، جس کے اساسی عقائد میں امامت کا عقیدہ بھی ہے، اسی طرح انہوں نے نبوت محمدی پرایمان واعتماد کی تجدید کی شاہ کلید سے وہ سارے بھاری پیچیدہ قفل کھول دیئے جو یونانی اورایرانی فلسفہ اور مصری وہندوستانی اشراقیت نے ایجاد کئے تھے، ایک تیر سے ان سب فتنوں کا شکار جن کا مسلمانوں کا ذہین طبقہ نشانہ بنا ہوا تھا۔

حضرت مجددالف ثانی کے تجدیدی کارناموں کا تجزیہ کرنے والے ایک محقق نے حضرت علی میاں ندویؒ کے اس تجزیہ کوزیادہ جامعیت والا محسوس کیا ہے اورلکھا ہے کہ ’’مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے تمام تجدیدی کارناموں کا ایک مرکزی نقطہ تلاش کیا ہےاوراسی کے اندرتمام کارناموں کوسمودیا ہے‘‘۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا ندویؒ کواس تعلق سے حضرت امام سرہندی مجددالف ثانیؒ سے بڑی مماثلت نظرآتی ہے، ہند سے اٹھے اس فتنہ کو جواسلام کی ابدیت کوچیلنج کررہا تھا، نہ صرف حضرت مجددالف ثانی نے دبایا بلکہ اس کی بیخ کنی کی، ٹھیک اسی طرح چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں مصر سے قومیت عربیہ کا فتنہ اٹھا جسے سرکاری طورپرمصر کے صدر جمال عبدالناصر کی سرپرستی حاصل تھی، حضرت ندویؒ نے اس کی خطرناکی کو محسوس کیا تو وہ اوران کی جماعت نے ان کو باطل نظریہ ثابت کیا، اورمسلمانوں کواس الحادی نظریہ سے نکالا، بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ناصر کا کلمہ مصر میں پڑھا جانے لگا تھا، الجمہوریہ (مصر یکم اکتوبر۱۹۷۰ء) نے یہاں تک لکھ دیا کہ نیا کلمہ ’’لاالہ الا اللہ ناصر حبیب اللہ‘‘ ہمارے آباء واجداد آپ کے نغمے گاتے رہے، آپ ان کے لیے ایک حسین کہانی یا خواب تھے، چارہزار برس سے اس امید میں جی

رہے تھے کہ آپ ظاہر ہوں آخر کار بیسویں صدی کے نصف آخر میں اہل مصر کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

اور اسی الجمہوریہ نے اس سے پہلے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کو لکھا کہ ''اے جمال عبدالناصر! اے وطنیت کے نبی! حریت کے رسول! شب معراج میں آپ کا نام اور آپ کا جسم آسمان پر پہنچا، قدوسیوں وابرار سے آپ کی ملاقات ہوئی، آپ اس قافلہ میں شامل ہوگئے جو اس زمانہ میں اور آسمان میں زندگی کا موجد ہے''۔

اس سے بڑھ کر یہ تشویشناک بات تھی کہ ممتاز فاضل اسکالر اور زعماء بھی اس فکر سے متأثر ہو رہے تھے، اور مشہور مصنف استاذ احمد حسن الزیات نے تو جمال عبدالناصر کے عہد میں ہی ازہر کے ترجمان مجلۃ الازہر میں ''امۃ التوحید تتوحد'' کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا جس میں انہوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ ''وہ وحدت جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی ایک عام اصول تھا، اس لیے کہ اس کی بنیاد عقیدہ پر تھی، عقیدہ کی کتنی ہی زندگی ہو وہ کمزور بھی پڑ جاتا ہے اور بدل بھی جاتا ہے اور وہ وحدت جس کی صلاح الدین ایوبی نے دعوت دی تھی وہ ایک خاص جزئیہ تھا، اس لیے کہ اس کی بنیاد طاقت پر تھی، اور طاقت کو ضعف بھی عارض ہوتا رہتا ہے اور اس کا زوال بھی ہو جاتا ہے؛ لیکن وہ وحدت جس کی جمال عبدالناصر نے دعوت دی ہے وہ باقی رہنے والی اور پھلنے پھولنے والی ہے اس لیے کہ اس کی عمارت تین بنیادوں پر قائم ہے، غذا اور اسباب معیشت میں اشتراکیت، اظہار خیال میں حریت اور نظام حکومت میں جمہوریت اور یہ تین عناصر اس وحدت کی بقاء کیلئے دائمی ضمانت ہیں''۔ (مجلۃ الازہر ۱۳۸۳ھ)

یہ فکر ونظریہ اور یہ عقیدہ ومسلک اسلام اور اس کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ منقطع کرنے کے لیے نہ صرف کافی تھا بلکہ دین اسلام اور مسلمانوں کو کمزور اور بے حیثیت کرنے کا خطرناک راستہ تھا، ان دونوں خطروں کو محسوس کرتے ہوئے کہ جس سے یہ احساس ہو چلا تھا کہ موجودہ حالات در پیش مشکلات ومسائل اور چیلنجز میں اسلامی تعلیمات رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں، ضرورت تھی کہ اس احساس کو ختم کیا جائے اور اس فکر ونظریہ کے داعی کو چیلنج کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ وہ اسلام دشمن طاقتوں کی سازش کا شکار ہے، چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنے عربی رسائل ومجلّات اور کتابوں ومراسلات کے ذریعہ سے تجدیدی کام انجام دیا اور دراصل بلاد عربیہ میں اس کام کے انجام دینے کی ضرورت تھی مگر چونکہ اس کے مسموم اثرات بلاد عجم خصوصاً برصغیر ہندوستان وپاکستان پر بھی پڑ رہے تھے اردو لٹریچر کے ذریعہ بھی اس کی خطرناکی اور نقصانات کو واضح کیا، چنانچہ ایک رسالہ ''عرب قوم پرستی اسلامی نقطہ نظر سے خطرناک کیوں؟'' لکھا، جو اس وقت مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوا، جس میں انہوں نے یہ واضح کیا کہ عرب اور اسلام کا کیسا مضبوط اور نہ ختم ہونے والا رشتہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لازم ملزوم ہیں اور بتایا کہ نبوت محمدی اور شریعت اسلامی نے اس کے قیام ودوام کیلئے کیسے وسیع وعمیق انتظامات کئے ہیں، اور اس کا تاریخی جائزہ لیا کہ عربوں میں قومیت کے احساس کا آغاز کب ہوا اور کیسے ہوا اور یہ ثابت کیا کہ تحریک قومیت کے اولین قائد عیسائی فضلاء تھے اور خلافت عثمانیہ کے خلاف عربوں کا ایک محاذ بنانا چاہتے تھے، اس کا نتیجہ مرکز خلافت کے انتقال کی تحریک تھی، اور یہ اصلاً یورپ کی آواز تھی جس پر وہ عرب لبیک کہہ رہے تھے جو یورپ کے پروردہ تھے، یا اس کی ثقافت سے متأثر تھے۔

اس تحریک ودعوت اور منحرف فکر ونظریہ کی جس قوت واعتماد سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے رفقاء وتلامذہ (بالخصوص مولانا سید محمد الحسنی) نے مخالفت کی وہ ایک عظیم جہاد

سے کم نہ تھا، چنانچہ مصری حکومت ان لوگوں کے خلاف احتجاج کیا اور وزارت خارجہ میں انھیں طلب کیا گیا، اس لیے کہ صدر ناصر کو جن اخبارات ورسائل کے تراشے ان دنوں پیش کئے جارہے تھے، ان میں ''البعث الاسلامی'' کے تراشے بھی ہوتے تھے جس کی سرپرستی حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ صاحب فرماتے تھے اور ادارت کا کام مولانا کے بھتیجا مولانا سید محمد الحسنی کے سپرد تھا اور یہ صدر صاحب اپنے جور وستم میں بھی معروف تھے اور اس زمانے میں مصر کی حکومت ہندوستانی حکومت سے بڑے ہی دوستانہ مراسم تھے، چنانچہ ہندوستانی حکومت کو بھی تشویش تھی اور سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے بہت سے لوگ خاموش تھے یا سرکار کی ہمنوائی کررہے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی طلبی کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ایک مرتبہ مجھے بھی وزارت خارجہ دہلی میں طلب کیا گیا اور اس کے سکریٹری عظیم حسین صاحب نے مجھ سے اس بارے میں سوالات کئے اس موقعہ پر وزارت خارجہ ہند کے اعلی افسران اور مشرق وسطی کے معاملات کے ماہرین بھی موجود تھے، میں نے صفائی سے عرض کیا کہ ہم نے اس موقف کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور ہم اس پر قائم رہیں گے، خواہ اس کے نتیجہ میں ہندوستان سے باہر جانے کی سہولتوں سے محروم کردیا جائے (یاد رہے کہ اس زمانہ میں میرا پاسپورٹ حکومت ہند کی تحویل میں تھا)۔ (کاروان زندگی حصہ دوم)

اس فکر ودعوت کی حضرت مولانا نے اس قدر قوت وبیبا کی سے مخالفت کیوں کی اور اس کے کیا اسباب تھے؟ خود ہی مولانا جواب دیتے ہیں ''صدر ناصر قومیت عربیہ کے سب سے بڑے علمبردار تھے، لیکن میری مخالفت کی بنیاد تنہا یہ بات نہیں تھی، شام کے بعثی لیڈر اور عراق کے متعدد قوم پرست مفکر اس بارے میں ان سے پیچھے نہیں تھے؛ لیکن ان میں سے کوئی عالم عربی کی روح اور دنیائے عرب کی آئندہ نسلوں کے لیے اتنا خطرناک نہیں تھا جتنے وہ تھے، وہ تنہا قومیت عربیہ کے علمبردار نہیں تھے، عالم عربی میں ایک بنیادی ہمہ گیر اور نہایت دوررس تبدیلی کے داعی وعلمبردار تھے، وہ عالم عربی کا رخ اس مرکزی نقطہ سے ہٹا کر جو اس کے فکر وعمل، شوق وتمنا اور جذبہ وجوش کا قبلہ رہا ہے، ہمہ گیر مادیت اور لامذہبیت (سیکولرزم) کی طرف پھیرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ایسے دوررس اور وسیع انتظامات اور تبدیلیاں کررہے تھے جن کا اثر (اگر کوئی عظیم انقلاب اور غیر معمولی واقعہ پیش نہ آئے) تو نسلوں اور صدیوں تک قائم رہنے والا تھا، وہ پورے عزم وتنظیم اور ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ساتھ اس منزل کی طرف رواں دواں تھے جس کے نزدیک معیار اور منتہائے کمال اشتمالیت یا کمیونزم اور اس کے داعی وعلمبردار تھے۔

قوم پرستی میں جب قدیم تہذیب کے احیاء کی سرمستی اور آباء پرستی کا عنصر بھی شامل ہوجاتا ہے تو وہ نہ صرف اخوت اسلامی کے حریف بلکہ نبوت محمدی کی رقیب بھی بنتی نظر آتی ہے، وہ جس رفتار سے ترقی کرتی ہے اسی رفتار سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت وامامت کا عقیدہ اور ان کے ''دانائے سبل، ختم الرسل اور مولائے کل'' ہونے کا اعتقاد بھی کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کے آثار وشواہد اہل قلم اور بعض سنجیدہ اور سال خورد مصنفین اور ادیبوں کی تحریروں میں نظر آنے لگے تھے، پھر اس قیادت نے عرب اور مصر کو ایک ذہنی واخلاقی انتشار اسلام کی برتری اور قیادت کی صلاحیت کی مایوسی کے احساس اور عزت واستحکام کو کسی اور فلسفہ زندگی کے سایہ میں اور کسی مشرقی یا مغربی بلاک کے دامن میں تلاش کرنے کا راستہ ہموار کردیا، ہر طرح کی تنقید واختلاف پر پابندی عائد کردی اور نفس وخواہشات کی ہر طرح کی آزادی دے دی، دس بارہ کے عرصہ میں اس قیادت کے دوران عرب ممالک

کے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسی تبدیلی آئی اور اولا د ابراہیمؑ کی آزری اور بت تراشی کے ایسے نمونے کھلی آنکھوں دیکھنے میں آئے جو نہ صرف ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے مرادف تھے بلکہ اس کے حدود کہیں کہیں اعتقادی ارتداد سے بھی مل جاتے تھے اور بہت سے نوجوان کی زبانوں سے صاف صاف کفریہ کلمات، دین اور اہل دین سے بیزاری کا اظہار تبرا کے حدود تک پہنچ جاتا تھا''۔

حضرت مولانا نے بلادعربیہ میں جا کر بڑے واضح طور پر یہ بات کہی کہ عرب قومیت میں غیرعربوں کے لیے کوئی کشش نہیں، ان کیلئے صرف ایمان، عمل صالح، اسلام کے پیغام اور دعوت میں کشش ہے، اسی طرح ایک دوسرے موقع پر فرمایا'' عالم عربی کو اصل خطرہ اسرائیل سے نہیں اس ضمیر سے ہے جس نے اپنا کام چھوڑ دیا''۔

اور یہ مدینہ منورہ میں اپنے ایک خطاب میں جس میں عالم اسلام کی مقتدر شخصیتیں قائدین، علماء اور رہنما حضرات موجود تھے فرمایا'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حریفوں اور آپ کی عالمی ابدی قیادت کو چیلنج کرنے والوں کا ہمیشہ انجام ناکامی اور ان کے سلسلہ کا انقطاع رہا ہے، اور ابتر صرف نسلی اور نسبی انقطاع ہی کا نام نہیں، اس کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے، اس میں بدتوفیقی، ناکامی، ذلت، گمنامی اور بے نشانی داخل ہے، لادینی اور ملحدانہ قیادتیں ہمیشہ ناکام رہیں اور رہیں گی، ہمیں ہمیشہ ان سے ہوشیار رہنا چاہئے، خودغرض، مفاد پرست رہنماؤں کو پہچاننا چاہئے، نیز اس طرز زندگی اور حکومتوں ومعاشروں کے اس انجام سے اجتناب کرنا چاہئے''۔ (ملاحظہ ہو کاروان زندگی)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ فکر ودعوت بلکہ کارتجدید وعظیم اصلاحی عمل کا آغاز اور پہلے سے ہو چکا تھا، جب ۱۳۷۰ھ میں انہوں نے عالم عربی کا دورہ کر کے حالات کا جائزہ لیا اور پیش آنے والے خطرات کا اندازہ لگا لیا تھا، جسے ان کی اس یادگار تحریر سے سمجھا جاسکتا ہے جو شیخ عبداللہ المزروع کی کتاب ''وصایا اساطین الدین والادب والسیاسة للشبان'' میں شامل ہے، اور مصنف کتاب کی فرمائش بھی بطور وصیت کے لکھی گئی تھی جو صاف تحریر کے الفاظ میں مختلف صداؤں کے شور اور دعوتوں کے زور میں ایک ''اذان'' کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے:

''اگر راقم کے لیے عرب ایک میدان میں جمع کر دیئے جائیں اور اس کے امکان وقدرت میں ہو کہ وہ ان سے براہ راست ایسا خطاب کر سکے جس کو ان کے کان سنیں اور دل قبول کریں، تو میں ان سے کہوں گا کہ میرے قابل احترام بھائیو! وہ دین اسلام جس کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے وہ تمہاری زندگی کا اصل سرچشمہ ہے اور اسی کے افق سے تمہاری صبح صادق طلوع ہوئی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی نسبت تمہارے لیے شرف کا باعث اور تمہاری اہمیت وعظمت کا سبب ہے، ہر خیر ونعمت جو تم کو ملی بلکہ ہر خیر جو دنیا کو پہنچی وہ آپ ہی کے ذریعہ سے اور آپ ہی کے دین کے راستہ سے ملی''۔

مکہ مکرمہ یہ تحریر عربوں کو دعوت فکر وعمل دینے کے لیے لکھی کہ آنے والے حالات میں دینی تشخص اور اسلامیات کو کیسے باقی رکھا جائے، جس کے لیے واضح طور پر راستہ متعین کیا کہ بس یہی ایک راستہ ہے، آپ نے ۲۰؍ربیع الاول ۱۳۷۰ھ مطابق ۳۰؍دسمبر ۱۹۵۰ء کو یہ پیغام دیا تھا، یہ وہاں دیا تھا جہاں سے خیر ساری دنیا کی طرف جاتا ہے، اللہ کو ان سے عالمی سطح پر اسلام کو اس کی توحید ورسالت کے عقیدہ اور فکر آخرت کے مسئلہ کو صاف کرنے کا کام لیتا تھا، جو ان کے حکیمانہ دعوتی انداز، سلامت فکر اور خالص دینی جذبہ ودینی حمیت وغیرت سے طاقتور طریقہ سے سامنے آیا، یہ ان کی مجددانہ شان کا ایک رخ تھا۔

❁❁❁❁

صفاتِ حمیدہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حلم

مولانا ڈاکٹر محمد اکرم ندوی آکسفورڈ، برطانیہ

حلم کے معنی ہیں ''بردباری'' یعنی غصہ اور دیگر جذبات و خواہشات کو قابو میں کرنا، ہر حال میں عقل و دانائی کو غالب رکھنا اور جلد بازی میں کوئی ایسی بات نہ کرنا، یا کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس پر بعد میں پچھتانا پڑے، قرآن وسنت میں اس صفت کی تعریف کی گئی ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دی گئی ہے، انبیائے کرام علیہم السلام کے اندر یہ وصف بدرجہ اتم موجود تھا، گو حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور بعض دیگر پیغمبر علیہم السلام سے وصف میں زیادہ ممتاز تھے، علمائے صالحین حلم کے حصول کے لئے مجاہدے کرتے، اس خوبی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور مخالفین واعداء کو برداشت ہی نہ کرتے بلکہ ان کی عزت کرتے اور اس میں شک نہیں کہ راہ اعتدال واستقامت پر چلنے کیلئے حلم سب سے زیادہ قیمتی توشہ بلکہ ناگزیر زادراہ ہے۔

ہمارے زمانے میں عوام کا ذکر نہیں، خواص میں بھی یہ صفت عنقاء ہوتی جارہی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ لوگ بات بات پر بھڑک جاتے ہیں، ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیتے ہیں، موقع و بے موقع لڑنے لگتے ہیں، گالی گلوچ اور سب وشتم پر اتر آتے ہیں، دوسروں کی تحقیر وتذلیل میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے، انہوں نے گمان کر رکھا ہے کہ جیتنے اور غلبہ حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے، چیخنا، چلانا اور زیادہ سے زیادہ گندی باتیں منہ سے اور قلم سے نکالنا، غرض اس پستی کردار اور رذالت کا مظاہرہ کرتے ہیں، جس سے شرم نہیں بلکہ گھن آئے اور تعفن، غلاظت اور بداخلاقی کو دینی غیرت کا نام دیتے ہیں، جبکہ اللہ اور اس کے پیغمبر نے واضح لفظوں میں اس سے منع کیا ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ برگزیدہ جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہے، چشم فلک نے ان سے زیادہ مقرب بارگاہ ایزدی، مضبوط ایمان، تسلیم رضا کی خو کا پابند، شاکر اور صابر کوئی انسانی گروہ نہیں دیکھا، ان کی عبادت بیخودی سے عبارت تھی، ان کے دلوں میں گداز فطرت پروانہ تھی، ان کی جبینوں نے حرم کو آنکھوں کی مئے مشکبو اور جگر کے لہو سے بسایا تھا، یہ ماورائے جہاں سے وارد پاک نفوس تھے، فرشتے ان پر رشک کناں تھے، خدا کا آخری پیغمبر ان سے خوش تھا، اور اس نے انہیں کی رفاقت ومعیت میں دین الٰہی کو سارے ادیان پر غالب کیا، اور خوب رب العالمین کتاب خالد میں ان مقدس یاران نبی کا مدح سرا ہے، یہ وہ ہستیاں ہیں جن سے ذروں ذروں نے روشنی پائی، جن کی محبت ہر پاک سینہ میں سمائی، ہر نظر میں جن کیلئے پیار ہے، ان کا ہر فرد مثال موج نسیم بہار ہے، ان صحابہ کرام میں متعدد حضرات کا نمایاں وصف حلم تھا، حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما حلیم کے حیثیت سے شاید سب سے زیادہ مشہور تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب بے شمار ہیں، آپ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے، عمرۃ القضاء کے موقع پر یعنی فتح مکہ سے ایک سال پہلے مسلمان ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو قربت حاصل تھی، کاتبین وحی میں آپ کا شمار ہوتا ہے، آپ سے مروی احادیث

صحیحین اور دیگر اصول ومراجع میں موجود ہیں، ائمہ مجتہدین نے آپ کے فتوؤں اور فیصلوں پر اعتماد کیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لئے دعا فرمائی: "اللّٰھم علم معاویة الکتاب والحساب وقه العذاب" اور "اللّٰھم اجعله هادیا، مهدیا، واهدبه" یہاں آپ کے جملہ فضائل کا احاطہ مقصود نہیں، صرف آپ کے حلم کے کچھ واقعات نقل کئے جاتے ہیں، یہ مضمون ابن ابی الدنیا (متوفی ۲۸۱ھ) کتاب "حلم معاویہ" اور امام ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کی سیر اعلام النبلاء پر مبنی ہے: "ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سخت سست کہا، جس پر گھر کے لوگ برہم ہوگئے اور آپ سے کہا گیا کہ اسے عبرتناک سزا دیں، آپ نے فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میرا حلم میری رعایا میں سے کسی کے جرم کے لئے تنگ پڑ جائے"۔

امام سیرین نقل فرماتے ہیں کہ ایک شخص جو بہت سیاہ تھا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا اور کہنے لگا: اے معاویہ! خدا کی قسم یا تو تم خود ٹھیک ہوجاؤ ورنہ ہم تمہیں درست کردیں گے، آپ نے فرمایا: کیسے؟ اس نے جواب دیا، قتل کرکے، آپ نے فرمایا اے بدو! تب تو ہم ٹھیک ہوجائیں گے۔

حضرت معاویہ کے پاس کچھ چادریں لائی گئیں، جنہیں آپ نے اہل شام کے درمیان تقسیم کردیا، ایک بوڑھے شخص کے حصہ میں بھی ایک چادر آئی اسے وہ چادر پسند نہیں آئی اور ناراضگی میں قسم کھا کر کہا: "میں اسے معاویہ کے سر پر ماروں گا، آپ کو اس کی خبر ملی تو فرمایا کہ اپنی نذر پوری کرو، ایک بوڑھے کو دوسرے بوڑھے کے ساتھ نرمی کرنی چاہئے، حضرت معاویہ کی ملاقات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ہوئی تو فرمایا: اے ابن عباس! حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات پر صبر کریں، ثواب کی امید رکھیں اور آپ پر اللہ کی جانب سے نہ کوئی غم آئے اور نہ کوئی برائی، اس پر حضرت ابن عباس نے فرمایا: "جب تک اللہ تعالی امیر المومنین (یعنی حضرت معاویہ) کو ہمارے درمیان باقی رکھے گا مجھ پر نہ کوئی غم آسکتا ہے اور نہ کوئی برائی، حضرت معاویہ نے ان کو دس لاکھ درہم دیئے مزید سامان اور دیگر اشیاء عطا کیں اور فرمایا کہ ان کو لیکر اپنے گھر والوں کے درمیان تقسیم کردیں۔

حلم وبردباری کے متعلق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے قصے تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں اور اسی خصلت حلم نے ان کو موافق ومخالف دونوں گروہوں میں محبوب بنا دیا تھا، لوگ ان پر تنقید کرتے اور کبھی کبھی سب وشتم کرتے لیکن وہ ان بداخلاقیوں پر صبر کرتے، ان کے مرتکبین کو کوئی سزا نہ دیتے، بلکہ ان کا احترام کرتے اور ان کو انعامات سے نوازتے: "ومایلقاها الا الذین صبروا وما یلقاها الاذو حظ عظیم" ہم صحابہ کرام سے محبت وعقیدت کے دعویدار ہیں، لیکن ان کے اسوہ سے بیزار، حضرت معاویہ اور دیگر صحابہؓ کے نام پر لوگوں کو گالیاں دیتے ہیں، بدزبانی کرتے ہیں، سخت کلامی کرتے ہیں اور اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ دوسرے مسلمانوں سے بھی اس کی توقع کرتے ہیں اور جو اس کی تقلید نہ کرے وہ ضعیف الایمان ہے اور صحابہ کرام سے اس کی محبت وعقیدت مشکوک ہے۔

ہمیں اس خودساختہ جھوٹے پیمانے سے توبہ کرنی چاہئے، صحابہ کرام سے محبت وعقیدت کا تقاضہ ہے کہ ہم اعمال واخلاق میں ان کی پیروی کریں، خود کو حلم وبردباری کا خوگر بنائیں، بدزبانی سے باز آئیں اور بدزبانی کرنے والوں کو نظرانداز کریں بلکہ انہیں معاف کریں، ان کے لئے دعا کریں اور ان کو انعام واکرام سے نوازیں، رضائے مولی میں اپنی عزت وآبرو قربان کردیں اور اس سادہ بلکہ فسادزدہ دنیا کو جنت بنادیں اور "فبما رحمة من الله لنت لهم ولو کنت فظا غلیظا لانفضوا من حولك" کی تعبیر حسین سے عالم بشریت کو محسود ملائک کردیں۔

یادرفتگاں

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد افتخار الحسن کاندھلویؒ

چند نقوش و تأثرات

مولانا محمد ارتضاء الحسن رضی کاندھلوی، مقیم دوحہ قطر

تمہید:

حضرت مولانا افتخار الحسن کاندھلویؒ کی شخصیت علمی، دینی اور اصلاحی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے، آپ کی حیات مبارکہ، مخلصانہ، مجاہدانہ اور سرفروشانہ کارناموں سے بھری ہوئی ہے، تقریباً آٹھ دہائیوں تک ان کا ستارۂ بلند اقبال برصغیر کے دینی افق پر جگمگاتا رہا اور وہ اپنی علمی اور روحانی شخصیت سے ایک عالم کو سیراب کرتے رہے، اللہ رب العزت نے آپکی عمر میں برکت عطا فرمائی، چنانچہ وفات کے وقت عمر مبارک سو سال چار ماہ اور سولہ دن تھی۔

آپ کو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شاہ عبدالقادر رائپوریؒ حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ رامپوریؒ اور ان جیسے دیگر اساطین امت کی نہ صرف زیارت کا موقع ملا، بلکہ ان میں سے اکثر کو قریب سے دیکھنے، سمجھنے، برتنے اور بھرپور علمی اور روحانی استفادے کی سعادت نصیب ہوئی، جس کی وجہ سے ان اکابر کے روحانی اثرات آپ کی شخصیت میں نمایاں تھے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی اکابر کا جیتا جاگتا نمونہ دیکھنا چاہتا تو آپ کی زیارت کرکے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر لیتا اور یہ کہنے پر مجبور ہوتا ''بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری''۔

بلند شخصیت، بے غرض جد و جہد، بے داغ زندگی اور مکارم اخلاق نے آپ کی ذات کو کھرا سونا اور سچا موتی بنا دیا تھا، بقول ربیعہ بن مقروم الضبی کے: ؎

هجان الحی کالذهب المصفیٰ
صبحـية ديمة يجنيه جان

زیر نظر مضمون میں راقم السطور کے پیش نظر آپ کے سوانحی حالات کو بیان کرنا یا جملہ کمالات کا احاطہ کرنا نہیں ہے، اس موضوع پر باذن اللہ عم محترم نامور مؤرخ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی مدظلہ فرزند و جانشین حضرت رحمۃ اللہ علیہ قلم اٹھائیں گے اور وہی اس کے حقدار ہیں، میرا مقصد تو اپنے ذاتی مشاہدات، تأثرات اور احساسات کو پیش کرنا ہے: ؎

میں نے اپنے آشیانے کیلئے ❁ جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

اصلاحی تعلق اور کسبِ فیض:

آپ نے اولاً حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا، پھر ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے مشورے سے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے ''آستانۂ معرفت'' سے وابستہ ہوئے اور چونکہ آپ کا باطن وہبی اور کسبی خوبیوں کے امتزاج کی وجہ سے طریقت کی حرارت اور حلاوت کو قبول کرنے کیلئے تیار تھا، اس لئے آپ نے سالوں کی راہ مہینوں میں، مہینوں کی ہفتوں میں اور ہفتوں کی دنوں میں طے کی اور اپنے شیخ کے اعتماد اور استناد سے بہت جلد سرفراز ہوکر چاروں سلسلوں میں ان کے خلیفہ و مجاز قرار پائے: ع

دیتے ہیں بادہ ظرف، قدح خوار دیکھ کر

بعد ازاں آپ نے اس نسبت کی ایسی لاج رکھی اور اس

طرح اس کا حق ادا کیا کہ جس کی نظیر تاریخ میں کم ملتی ہے، آپ نے اپنی صلاحیتوں سے جو کچھ علمی، دینی اصلاحی، فکری اور انقلابی کارہائے نمایاں انجام دیئے، ہر انصاف پسند مؤرخ انہیں آب زر سے لکھنے پر مجبور ہوگا، اور دردِدل، راست بازی، اولوالعزمی، خودداری، خود شناسی، سحر انگیزی، محنت و جانفشانی، جرأت و بے باکی، ظاہر و باطن کی یکسانیت اور اعلیٰ کردار کے جو لازوال نمونے پیش کئے ہیں، رہتی دنیا تک ان کو یاد رکھا جائے گا: ؎

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

علمی مقام:

اللہ رب العزت نے آپ کو جو علمی مقام عطا فرمایا تھا وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے، تقویٰ اور کردار کی پاکیزگی نے آپ کے علم میں چار چاند لگا دئے تھے اور بلا شبہ آپ ”واتقوا اللّٰہ و یعلمکم اللّٰہ“ کا حسین پیکر تھے، حدیث، تفسیر، فقہ اور تاریخ پر گہری نظر تھی، احادیث مبارکہ کے طویل ترین متون قرآنی آیات کی طرح ازبر تھے اور ان کی شرح و توضیح میں اقوال ائمہ حیران کن حد تک مستحضر، تفسیر میں مطالعہ کی وسعت کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت رائے پوری قدس سرہ نے زیر مطالعہ کتب تفسیر کی بابت استفسار فرمایا تو آپ نے فنِ تفسیر کی تقریباً پندرہ امہات الکتب کا تذکرہ کیا، آپ کے درسِ قرآن کی عمر نصف صدی سے زائد ہے، اس عرصے میں آپ نے پانچ مرتبہ پورے قرآن کی تفسیر کی جن میں سے آخری دور ۳۲ر سال میں مکمل کیا، جبکہ روزانہ فجر کے بعد کم از کم ایک گھنٹہ درس دینے کا معمول تھا۔

فقہ و فتاویٰ میں بھی آپ امتیازی مقام رکھتے تھے، فقہی کلیات اور جزئیات پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی، متقدمین فقہاء کی کتابوں پر گہری نظر ہونے کے باوصف حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے ”فتاوی محمودیہ“ پر غیر معمولی اعتماد فرماتے تھے، ایک مرتبہ ناچیز سے فرمایا کہ: ”فتاوی محمودیہ کو میں ظاہر الروایہ کا درجہ دیتا ہوں“ چنانچہ اگر راقم السطور نے کبھی کسی مسئلہ میں اختلاف رائے کیا اور بطور حوالہ ”فتاوی محمودیہ“ کا نام پیش کر دیا تو آپ نے بصد بشاشت اس کو قبول کرلیا اور خوشی کا اظہار فرمایا۔

آپ کا علم برائے علم نہیں تھا؛ بلکہ برائے عمل و دعوت عمل تھا، خود بھی ”معلومات“ کو ”معمولات“ بنانے کی عادی تھے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے تھے، آپ نے اپنے علم کے ایک ایک جزء کو معتقدین اور متوسلین تک پہنچانے میں کسی بخل سے کام لیا اور نہ ہی ”کلموا الناس علی قدرعقولهم“ جیسے اصولوں کو آڑے آنے دیا، اپنے علمی سمندر سے ایسے ایسے موتی عام فہم اور سادہ انداز میں حاضرین کے سامنے پیش فرماتے، جن کی حیثیت خالص علمی ہوتی، بلکہ بعض مرتبہ وہ مضامین عام علماء کی دسترس سے بھی باہر ہوتے، غالباً یہی وہ عادت مبارکہ ہے جس کی وجہ سے ان کے علم میں غیر معمولی برکت ہوئی اور بہت سے علماءِ علم کے اس بحر ذخار کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

حدیث کی ایک عالی سند:

من جملہ اسانید حدیث کے آپ کے پاس ایک بہت عالی سند تھی جس کے مطابق آپ کے اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے درمیان صرف دو واسطے تھے: (۱) شاہ علاؤالدین پھلتی رحمہ اللہ۔

(۲) شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی رحمہ اللہ۔

حیات مبارکہ کے اخیر سالوں میں جب علماء عرب کو آپ کی اس خصوصیت کا علم ہوا تو سعودی عرب اور قطر وغیرہ کے متعدد علماء عرب نے مختلف کتب حدیث کی آن لائن قرأت کر کے اجازت حدیث حاصل کی، اس طرح اللہ رب العزت نے آپ کے فیض کو عالم عرب تک پہنچا دیا۔

علمی استحضار:

آپ کی علمی زندگی میں جہاں وسعت علمی نمایاں تھی وہیں آپ کا استحضار حیرت انگیز تھا، نمونہ کے طور پر چند واقعات پیش خدمت ہیں:

۱-ایک مرتبہ ایک جلسے میں تقریر سے فارغ ہوئے تو دیہاتی حضرات معمول کے مطابق مختلف قسم کی بوتلوں میں پانی دم کرانے کیلئے لے آئے، انہی بوتلوں میں آپ کی بیدار نگاہوں نے شراب کی بوتل کو پہچان لیا جو یقیناً فی الحال صاف ستھری اور بالکل پاک تھی، مگر اس پر دم کرنے سے انکار کردیا، اس کے استعمال پر نکیر فرمائی اور ناچیز کی طرف متوجہ ہوکر حضرت ابوہریرہؓ کی "النهي عن الدباء والحنتم والنقير" والی روایت سے ایسا لطیف استدلال فرمایا کہ بندہ محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

۲-ایک صاحب نے مظفرنگر کی ایک مسجد کا واقعہ نقل کیا کہ وہاں امام صاحب نے فجر کی نماز لحاف اوڑھ کر پڑھائی، آپ نے برجستہ اس طرز عمل پر نکیر فرمائی اور حضرت ابوسعید خدریؓ کی "النهي عن اشتمال الصماء" والی روایت سے استدلال کیا، گرچہ یہاں اختلاف رائے کی گنجائش ہے، مگر آپ کا منٹ کے ہزارویں حصے میں سمندر حدیث کے اندر غوطہ لگا کر متعلقہ حدیث کو پیش کرنا علم حدیث سے غیر معمولی ربط کی دلیل ہے:

حدیث مصطفیٰ سے ربط تھا قلب مصفیٰ کو
زباں میں کوثر و تسنیم کی شامل حلاوت تھی

۳- ایک مرتبہ امام مسجد اقصیٰ ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے اور انہوں نے مظفرنگر کے قصبہ منصور پور میں ایک بڑے مجمع کو ظہر کی نماز پڑھائی اور مسافر ہونے کے باوجود اتمام کیا (یعنی چار رکعت نماز پڑھائی) اور چونکہ وہ شافعی المسلک تھے اور ان کے مسلک میں مسافر کیلئے اتمام جائز ہے، اس لئے نمازیوں میں اہل علم کو کوئی اشکال نہیں ہوا؛ لیکن جب آپ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو فرمایا کہ مقیم مقتدیوں کی ظہر کی نماز نہیں ہوئی، کیونکہ امام صاحب حنفی مسلک کی رو سے آخری دو رکعت میں متنفل تھے اور صلاۃ المفترض خلف المتنفل احناف کے نزدیک جائز نہیں ہے، اس واقعہ سے آپ کی فقہی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے یہ اور اس طرح کے بے شمار واقعات آپ کی تبحر علمی پر شاہد عدل ہیں:

کیا لوگ تھے جو راہ وفا سے گزر گئے
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

تواضع، مروت اور احترام علماء:

قدرت نے آپ کے مزاج میں غیر معمولی تواضع اور انکساری ودیعت رکھی تھی، شان وشوکت اور کروفر سے دور رہتے تھے، سفر و حضر میں اگر آپ کے اکرام یا استقبال کا کوئی خاص اہتمام کیا جاتا تو طبعی طور پر ناگواری ہوتی اور سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بناوٹی تواضع تو ہر ایک آسانی سے اختیار کرلیتا ہے، مگر آپ کے یہاں حقیقت ہی حقیقت تھی، تصنع کا نام ونشان نہیں تھا؛ کیفیت ہی کیفیت تھی رسمیت کا تصور نہیں تھا اور للّٰہیت ہی للّٰہیت تھی دکھلاوے کا کوئی خانہ نہیں تھا۔

شہرت، ناموری اور "اونچی اڑان" کی خواہش سے کوسوں دور رہتے تھے، آپ نے عملی زندگی کے آغاز میں اپنی دینی جدوجہد کا جو ایک دائرہ کھینچا تھا، پوری زندگی اس دائرے سے باہر نہیں نکلے، بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کے اسفار جو کہ موجودہ دور میں مقبولیت کا معیار بن چکے ہیں، احباب اور اہل تعلق کے ہزار اصرار کے باوجود ان کیلئے رضامند نہیں ہوئے، بالخصوص مولانا ابراہیم پانڈور نے افریقہ کی بار ہا دعوت دی اور اصرار کیا، مگر ہر مرتبہ آپ کی یہی سرشت مانع رہی، اس کے باوجود اللہ رب العزت نے آپ کے چشمۂ فیض سے ایک عالم کو سیراب کیا۔

آپ کے دولت کدہ پر ہر طرح کے لوگ آتے تھے، اشراف دین بھی اور اشراف دنیا بھی اور آپ "انزلوا الناس منازلھم" کے نبویؐ اصول پر سختی سے عمل پیرا رہتے تھے، البتہ اگر کسی بزرگ یا عالم دین کی آمد ہوتی تو تواضع اور جذبۂ ضیافت واکرام دوبالا ہو جاتا اور آنیوالا ایسا تاثر لیکر جاتا جو زندگی بھر تازہ رہتا۔

راقم السطور کے نزدیک آپ کی ایک بڑی خصوصیت "علمی تواضع" تھی، علمی مباحث کو کبھی "ناک کا مسئلہ" نہیں بناتے تھے، اگر کسی کی رائے دلیل کے اعتبار سے قوی معلوم ہوتی تو قبول کرنے میں تردد نہ فرماتے، اقران اور معاصرین سے تقابل کبھی حاشیۂ خیال میں بھی نہ آتا، بلکہ ان کے اعزاز واکرام میں فخر محسوس کرتے اور خود سراپا تواضع بن جاتے، اس سلسلہ کے دو واقعات کے نقل پر اکتفاء کرتا ہوں، جن کا میں عینی شاہد ہوں:

۱- ایک مرتبہ جامعہ مظاہر علوم کی شوری میں شرکت کیلئے سہارنپور تشریف لے گئے، دوران قیام ناچیز سے فرمایا کہ "مولانا یونس صاحب سے ملاقات کرنی ہے"، چنانچہ میں آپ کو مخدومی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحبؒ کے حجرے میں لے گیا، شیخ نے اکراماً ان کیلئے گدا بچھوایا اور گاؤ تکیے لگوائے، مگر آپ نیازمندانہ انداز میں قدرے تکلف کے ساتھ بیٹھے، ان دو جبال علم کی ملاقات کے دوران ناچیز جو ہر بات کو بڑی اہمیت کے ساتھ نوٹ کر رہا تھا، اس وقت ورطۂ حیرت میں پڑ گیا جب شیخؒ نے کچھ ناصحانہ کلمات کہے، جن میں بطور خاص اخلاص پر زور دیا تو آپ نے گردن جھکا کر اس انداز سے ان نصائح کو سنا جیسے کوئی شاگرد یا عام مرید ہو، اور آخر میں متواضعانہ انداز میں فرمایا: "میں پوری کوشش کروں گا، آپ دعا فرمائیں!" حالانکہ آپ مقام ومرتبہ کے اعتبار سے کم نہیں تھے، بلکہ عمر میں تو شیخ سے کافی بڑے تھے، ناچیز اپنی کم مائیگی کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہا کہ اس واقعہ میں حضرت شیخؒ کی مخصوص روحانی کیفیت کو سرمایۂ دل وجاں بناؤں یا آپ کی اس عالمانہ تواضع کو سرمۂ چشم، جس میں آپ اپنے اقران کی صف میں بالکل ممتاز نظر آتے ہیں۔

۲- ایک مرتبہ ایک اہم علمی مشورے کیلئے حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری مدظلہ سے ملنے دیوبند تشریف لے گئے، وہاں سے مظفرنگر جانا تھا، جہاں کئی روز قیام پہلے سے طے تھا، اس موقع پر ڈرائیور کے علاوہ آپ کا رفیق سفر تنہا ناچیز تھا، مفتی صاحب کی مجلس چونکہ بالائی منزل پر تھی جہاں آپ کا چڑھنا دشوار تھا، اسلئے مفتی صاحب نے نیچے زنانے حصے کے ایک گوشے میں بیٹھنے کا انتظام کیا، دوران ملاقات مفتی صاحب نے مدرسہ گنبدان پانی پت کی ماہانہ مجلس کے بعض معمولات پر اپنے صاف گوئی کے مخصوص انداز میں چند ایسے تحفظات کا اظہار کیا، جن کی بنیاد کسی صاحب کی بیان کردہ غلط معلومات پر تھی، اس عجیب وغریب صورت حال میں ناچیز نے آپ کی طرف دیکھا تو چہرے پر ان غلط الزامات کی وجہ سے کبیدگی کے آثار نمایاں تھے، مگر آپ مفتی صاحب کی مروت اور احترام میں بالکل خاموش رہے، یہ بھی نہیں کہا کہ "یہ باتیں خلاف واقعہ ہیں" یہ منظر دیکھ کر ناچیز نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا اور ان بے بنیاد الزامات کی تردید کی اور گنبدان کے معمولات کی ازاوّل تا آخر وضاحت کی، حضرت الاستاذ یہ تفصیل سن کر نہ صرف مطمئن ہو گئے، بلکہ غلط اطلاعات پر شدید افسوس کا اظہار فرمایا، میری گفتگو کے دوران آپ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی، جو چند لمحے پہلے کی کبیدگی کو دور کر کے اپنی جگہ بنا رہی تھی۔

ان دونوں موقعوں پر آپ نے تواضع کے جو نمونے پیش کئے وہ اپنی نظیر آپ تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ارشاد نبویؐ "من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰہ" کا مفہوم اپنی تمام تر گہرائی کے ساتھ ان کے دل میں اتر چکا تھا اور وہ اس حقیقت کو کما حقہ سمجھ چکے تھے کہ

تواضع ذلت کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں رفعت ہی رفعت ہے، ایسی رفعت جوعزت وذلت کے مالک کی عطا کردہ اصلی ہے، انسانوں کی خودساختہ (مصنوعی) نہیں ہے، ذوق دہلوی مرحوم کا یہ شعر آپکی شخصیت کا آئینہ دار ہے: ؎

تواضع کا طریقہ صاحبو! پوچھو صراحی سے
کہ جاری فیض بھی ہے اور جھکی جاتی ہے گردن بھی

انداز بیان اور اسلوب خطابت:

تقریر ہو یا درس قرآن، وعظ ونصیحت ہو یا مجلسی گفتگو، آپ کا انداز تکلم سادہ اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی پراثر، دل نشیں اور دلوں کو فتح کرنے والا تھا اور اس میں ایسی مقناطیسی کشش تھی جو سامعین کو اپنی طرف متوجہ رکھتی تھی، جب خطاب فرماتے تو پورا مجمع گوش برآواز رہتا، حالانکہ عام مقررین کی طرح نہ انداز لچھے دار تھا اور نہ ہی زینت گفتار کیلئے بےمقصد لفاظی کی عادت، مگر اس کے باوجود قادرالکلام ایسے جیسے پہاڑوں سے آبشار گررہا ہو:

نہ بادہ، نہ صراحی، نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جاناناں

آپ ''نرم دم گفتگو گرم دم جستجو'' تھے انداز بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا؛ لیکن اگر دین اسلام پر کوئی آزمائش آجاتی خواہ وہ نسبندی کی شکل میں ہو یا توہین قرآن کی، قادیانیت کے سر اٹھانے کی شکل میں ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو آپ کی تقریروں میں ایک جوش پیدا ہوجاتا، لہجہ میں ایک قسم کی کرختگی آجاتی اور ایسی تقریریں فرماتے کہ بڑا سے بڑا مجمع آپکی للکار پر سہم جاتا اور ایک اشارے پر ہر قسم کی قربانی دینے کیلئے تیار ہوجاتا:

تری الناس ما سرنا يسيرون خلفنا
وان نحن او مأنا الى الناس وقفوا

انہوں نے پوری زندگی باطل کے آگے سر نہیں جھکایا، خود اعتمادی ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھی اور تعجب خیز حد تک ان کو اپنے دست و پا پر بھروسہ تھا، حق گوئی اور بیباکی میں اپنی مثال آپ تھے:

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے بندوں کو آتی نہیں روباہی

آپ کے عوامی واصلاحی بیانات میں علمی رنگ انتہائی گہرا اور چوکھا ہوتا، کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ بخاری شریف کا درس ہورہا ہے، بعض مرتبہ سند پر بھی گفتگو کرتے اور سند کے لطائف بیان فرماتے اسکے باوجود پورے بیان میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی جس کو سامعین کے لئے ناقابل فہم قرار دیا جاسکے۔

مجلس کا انداز:

آپ کی مجلسوں میں جو رونق، بانکپن، خوش رنگی، ثمر خیزی اور برکت نمایاں تھی وہ اس کم علم وشعور کو کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملی، جس سے ملاقات کرتے خوش دلی سے ملتے، مذاق بھی کرتے، دل لگی بھی فرماتے، ضرورت کے وقت لہجے میں سختی بھی آجاتی، غصہ بھی ہوجاتے اور حسب مراتب سخت سست بھی کہہ دیتے، اس کے باوجود کسی کے دل میں ناگواری اور آپ کے تئیں عقیدت ومحبت میں کوئی فرق نہ آتا، جس کی وجہ آپ کے خلوص اور خداداد مقبولیت کا حسین امتزاج تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آنے والوں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی جن کا مقصد دعا اور تعویذ ہوتا اور یہ لوگ آپ کے اصل فن اور اصل جوہر سے استفادہ کرتے کم نظر آتے، آپ ناگواری کے باوجود خدمت خلق کے جذبے سے ہر ایک کی ضرورت پوری کرنے میں مشغول رہتے، مگر جہاں کسی نے تصوف یا سلوک کا کوئی مسئلہ پوچھ لیا یا کوئی علمی بحث چھیڑ دی یا کسی اللہ والے کا تذکرہ کردیا تو فوراً چہرے پر بشاشت آجاتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے دل کا ساز چھیڑ دیا ہے اور پھر علم ومعرفت کا ایسا

نغمہ بجتا کہ اہل ذوق تمنا کرتے کہ یہ مجلس کبھی ختم نہ ہو: ؎

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
تمہیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ملی اور اصلاحی خدمات:

آپ کی زندگی ایک ''جہد مسلسل'' سے عبارت تھی، پوری دنیا میں کہیں بھی اگر مسلمانوں پر کوئی آزمائش آجاتی تو بے چین ہو جاتے، پھر کبھی فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھی جاتی اور کبھی روزانہ کا معمول بنا کر امام جزریؒ کی ''حصن حصین'' کا ختم ہوتا، اسی طرح بدعات، رسومات اور منکرات کی تردید اور باطل فرقوں کی بیخ کنی کے موقع پر آپ ''شمشیر براں'' بن جاتے، زیادہ تر آپ کی اصلاحی جدوجہد کا مرکز مغربی یوپی اور ہریانہ و پنجاب کے علاقے ہوتے جہاں آپ نے بڑی تعداد میں مدارس اور مکاتب قائم فرمائے، ہریانہ اور پنجاب کی بعض ایسی تاریخی مساجد جو غیر مسلموں کے قبضے میں تھیں، بلکہ شراب کے اڈوں میں تبدیل ہو چکی تھیں، ان کو بازیاب کرا کے آباد کیا، سردی، گرمی، برسات اور راستوں کی ناہمواری کے باوجود بلا مبالغہ آپ نے ان علاقوں کے ہزاروں سفر کئے، جس علاقے کو توجہ کا مرکز بنایا وہاں شب و روز کی کوششوں سے صالح انقلاب برپا کر دیا، بلاشبہ آج ان علاقوں کے دینی ماحول میں آپ کی قربانیوں کے غیر معمولی اثرات ہیں۔

آپ کی ساحرانہ شخصیت سے تربیت پا کر سینکڑوں لوگ کندن ہو کر نکلے اور سینکڑوں حلاوت ایمانی سے لذت آشنا ہوئے، کتنے ہی اہل ارادت ایسے تھے جن کی حیثیت بیعت کے وقت ''خام مال'' سے زیادہ نہیں تھی؛ لیکن آپ کی زود اثر صحبت اور تربیت نے ان کو کارآمد اور گراں قدر مصنوعات میں تبدیل کر دیا، آپ کے وابستگان نے آپ سے اتباع سنت کا جذبہ اور حالات کی موافقت و مخالفت دونوں صورتوں میں ذوق عمل سے سرشار رہنا سیکھا۔

یہ حلقۂ ارادت جن کی اصلاح و تربیت کے لئے آپ نے خون جگر کا نذرانہ پیش کیا تھا اور جنہوں نے آپ سے والہانہ محبت کی تھی، آج اپنے محبوب قائد اور مربی کے وصال پر رنجیدہ، افسردہ اور اشکبار ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں: ؎

ویراں ہے مے کدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

محبوبیت اور مقبولیت:

اللہ تعالی نے آپکی شخصیت میں جاذبیت ودیعت رکھی تھی جو ایک مرتبہ زیارت کر لیتا وہ گرویدہ ہو جاتا، جہاں پہنچ جاتے ساری فضاء آپ کی روحانی خوشبو سے عطر بیز اور مشکبار ہو جاتی، اہل ارادت آپ پر اس طرح جاں نثار تھے جیسے شمع پر پروانے، جہاں سے گزر جاتے چاہنے والوں کی ایک بھیڑ لگ جاتی، راقم السطور نے بارہا مشاہدہ کیا کہ سفر کے دوران کسی چوراہے وغیرہ پر ٹریفک کی وجہ سے اگر گاڑی رک جاتی تو تھوڑی ہی دیر میں چاروں طرف سے لوگ جمع ہو جاتے اور سلام و مصافحہ کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش کرتے، کسی کے پھل کی دکان ہے تو وہ پھل پیش کر رہا ہے، کسی کی چائے کی دکان ہے تو وہ آپ کو اور رفقاء کو چائے پلانے کی کوشش کر رہا ہے، چند ہی لمحوں میں ''ہجومِ عاشقاں'' کے یہ مناظر آپ کے اسفار کے دوران عام سی بات تھی: ؎

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے ''مرد خلیق''

ایک مرتبہ کاندھلہ کے قریب تبلیغی اجتماع تھا، دعا کے بعد واپسی کے لئے جب آپ گاڑی میں بیٹھے تو زیارت اور مصافحہ کے لئے مجمع بے قابو ہو گیا، راقم السطور آپ کے پیچھے والی گاڑی میں سوار تھا، تھوڑی دیر میں جب گاڑیوں کی رفتار قدرے تیز ہوئی تو ناچیز نے ایک عجیب و غریب منظر کا مشاہدہ کیا، جب لوگوں نے

دیکھا کہ اب زیارت ومصافحہ ممکن نہیں تو وہ تیزی سے دوڑتے اور آپ کی گاڑی کو ہاتھ لگا کر اس کو چوم لیتے گویا کہ زبان حال سے کہتے ”ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے“ سادہ لوح دیہاتیوں کی اس حرکت پر تبصرہ نگار منفی یا مثبت جو بھی تبصرہ کریں، مگر ناچیز کے نزدیک اس میں ”فیوضع له القبول فی الارض“ کی ضرور کرشمہ سازی تھی۔

سلیقه شعاری، نفاست اور خدمت لینے میں تکلف:

لباس میں سادگی کے باوجود آپ جامہ زیب تھے، خاص طور پر عیدین یا کسی اہم موقع پر جب تیار ہوتے اور مخصوص طرز کا عمامہ باندھ لیتے تو کشش اور وقار دوبالا ہو جاتا، ہر وقت صاف ستھرے رہتے تھے، روزانہ غسل کا معمول تھا، بلکہ گرمیوں میں اکثر ظہر اور عصر کی نماز میں غسل کر کے مسجد تشریف لاتے تھے، آپ کی قیام گاہ ہمیشہ صاف ستھری اور ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے رکھی ہوئی ہوتی، کبھی یاد نہیں کہ آپ بستر پر نہ ہوں اور لحاف یا اوڑھنے کی چادر تہ کی ہوئی نہ ہو یا بستر پر سلوٹیں ہوں، اکثر اپنے کام خود ہی کرتے تھے اور مزاج میں فطری تواضع کی وجہ سے کسی سے خدمت لینا بالکل پسند نہیں تھا، جسکی وجہ سے بعض مرتبہ بڑی پریشانی اور تکلیف اٹھانی پڑتی، اگر مجبوراً خدمت لینی پڑتی تو بقدر ضرورت اور ناگواری کے ساتھ لیتے، اگر سفر درپیش ہوتا تو مکمل تیاری خود ہی کرتے، اٹیچی اتنے سلیقے سے مرتب کرتے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے، اور اس میں کپڑوں کے علاوہ چند چیزیں بہت اہتمام سے رکھتے مثلاً: مسواک، چھوٹی قینچی، کنگھی، چھوٹے سائز کا چاقو، سرمہ دانی وغیرہ اور فرماتے کہ ”یہ چیزیں مسنون ہیں، کام آئیں یا نہ آئیں سنت کا ثواب تو ملے گا“۔

اکثر قیام گاہ میں تنہا رہتے تھے، بیمار ہوں یا صحت مند، سفر میں ہوں یا حضر میں، ہوٹل کے کمرے میں ہوں یا ہسپتال کے، کسی کو رات میں انکے پاس ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی، بغیر کسی خادم کے تہجد میں اس پابندی کے ساتھ اٹھنا کہ جس سے تخلّف متصور نہ ہو یہ آپ کا طرۂ امتیاز تھا، کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مشائخ کو تہجد وغیرہ میں اٹھانے اور ضروریات میں مدد کرنے کے لئے ایک یا دو خادم ضرور ہوتے ہیں اور بعض مرتبہ تو خدام کی پوری جماعت ہوتی ہے، بارہا ایسا ہوا کہ پیرانہ سالی کے ان ایام میں جب کہ آپ بغیر سہارے کے مسجد تک نہیں جا سکتے تھے، رات میں جب تہجد کے لئے اٹھے اور وضو کا ارادہ کیا تو پتہ چلا کہ پانی نہیں ہے، اب اگر تھوڑی دیر انتظار کر لیتے تو فجر کی نماز میں کوئی نہ کوئی ضرور آ جاتا اور پانی کا انتظام ہو جاتا مگر تہجد فوت ہو جائے یہ کسی قیمت گوارہ نہ تھا، چنانچہ رات کے اندھیرے میں پانی کا برتن لیکر پہلے مسجد گئے، وہاں پانی نہیں ملا تو جامع مسجد گئے، اس کا دروازہ بند ملا تو محلّہ کے ایک مندر سے پانی لائے اور جب تک وضو کر کے مصلے پر اپنے رب کے سامنے کھڑے نہیں ہو گئے اس بے قرار کو قرار نہ آیا،، غالباً اسی موقع کیلئے کہا گیا ہے ”الاستقامة فوق الف کرامة“ کہ استقامت ہزار کرامتوں سے بڑھ کر ہے ”وفی ذالك فلیتنافس المتنافسون“۔

ملنساری اور ظریف المزاجی:

کردار کے اعتبار سے شخصیت کے غیر معمولی سنجیدہ ہونے کے باوصف آپ خشک مزاج یا ”عبوساً قمطریرا“ نہیں تھے، بلکہ مزاج میں ظرافت تھی، حاضرین سے مزاح بھی فرماتے، مگر بعض مرتبہ اس میں بڑی معنویت اور گہرائی ہوتی ”مشتے نمونہ از خروارے“ کے طور پر چند جملے سپرد قرطاس ہیں:

۱- ایک مرتبہ ایک صاحب اصرار کرنے لگے کہ میرے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے! فرمایا کہ ”اس سے کیا ہوگا؟ میں پورے دن اپنے سر پر کھجاتا رہتا ہوں مجھے تو کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوتا“۔

۲- ایک دیہاتی نے سوال کیا کہ: اجی! آپ مظاہر علوم میں

کتنے سال پڑھے؟ آپ نے فرمایا ''پڑھے وڑھے تو کچھ نہیں، البتہ وہاں پانچ سال پڑے رہے''۔

۳- ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کی فراغت کس سن کی ہے؟ فرمایا''فراغت'' تو آج تک نہیں ہوئی، البتہ ۱۳۶۳ھ میں اپنا بوریا بستر لیکر گھر آ گئے تھے''۔

۴- ایک صاحب نے عرض کیا کہ میں بہت پریشان ہوں ایک عامل نے بتایا ہے کہ تمہارے دل پر جادو کیا گیا ہے، فرمایا کہ ''یہ دل کی بات دل سے نکال دو''۔

ناچیز پر شفقت:

راقم السطور نے والد صاحبؒ کے حکم پر افتاء کے سال آپ سے بیعت ہوکر اصلاحی تعلق قائم کر لیا تھا، مگر چونکہ آپ کے برادر کلاں حضرت مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی قدس سرہ میرے حقیقی دادا تھے، غالباً اسی نسبت کی وجہ سے آپ کا میرے ساتھ ایسا مشفقانہ تعلق تھا، جس میں تشجیع ہی تشجیع تھی، زجر وتنبیہ کا کوئی خانہ نہیں تھا، حسن ظن ہی حسن ظن تھا، سوء ظن کا کوئی تصور نہیں تھا، کبھی مجھے ''تم'' کہہ کر خطاب نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ ''آپ'' کہہ کر مخاطب ہوئے، کبھی مجرد نام نہیں لیا، بلکہ ہمیشہ ''بھائی رضی'' کہا، یاد نہیں کہ مجھے کبھی ڈانٹا ہو یا ناراض ہوئے ہوں، ناچیز کی بڑی سے بڑی کوتاہی کو اس طرح درگذر کر دیتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

فماراقنی من لا قنی بعدبعده
ولا شاقنی من ساقنی لو صاله
ولا لا ح لی مذ ند نذٌ لفضله
ولا ذوخـــلال حاز مثل خلاله

یادوں کے جھروکے سے بغیر کسی تبصرے کے چند واقعات کے نقل پر اکتفا کرتا ہوں، جن سے ناچیز کے تئیں آپ کی شفقت، عنایت اور مروت کا اندازہ ہو سکے گا۔

جب میں نے مشکوٰۃ شریف کے سال دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا تو چند ہی دنوں بعد آپ کی حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے ملاقات کیلئے دیوبند آمد ہوئی، میں نے چھتہ مسجد میں ملاقات کی، آپ میرا ہاتھ پکڑ کر مفتی صاحب کے حجرے میں لے گئے، ان سے ملوایا، تعارف کرایا اور مفتی صاحب سے فرمایا کہ ''اصلاح وتربیت کیلئے میں ان کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں، ان پر خصوصی توجہ فرمائیں!'' اور مولانا ابراہیم افریقی صاحب جو کچھ فاصلے پر کھڑے تھے، ان سے فرمایا کہ ''یہ میرا پوتا ہے اس کو کبھی اندر آنے سے نہ روکا جائے'' اس بات کی اہمیت اور اس خصوصیت کی قدر وقیمت کو وہی شخص پہچان سکتا ہے جس نے حضرت فقیہ الامتؒ کی شان مرجعیت کا مشاہدہ کیا ہے، مگر افسوس صد افسوس کہ چند ہی ایام کے بعد مفتی صاحب کا افریقہ کا سفر ہوا، جو سفر آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور پھر آپ کی ہندوستان واپسی نہ ہو سکی۔

ایک مرتبہ لکھنؤ، کانپور اور ہردوئی وغیرہ کا سفر ہوا جس میں منجملہ رفقاء سفر کے ناچیز بھی تھا، اس سفر کے دوران مجھے جہاں موقع ملتا میزبان حضرات سے رات میں یہ طے کر لیتا کہ فجر کی اذان سے پہلے مجھے حضرت کے لئے ایک پیالی چائے چاہیے، چنانچہ وہ بہت خوشی اور سعادت مندی کے ساتھ اس کا انتظام کر دیتے، اذان فجر سے قبل ناچیز جب چائے لیکر کمرے میں داخل ہوتا تو آپ ذکر ودعا اور تہجد کے معمولات سے فارغ ہوکر اذان فجر کے انتظار میں تسبیح لئے بیٹھے ہوتے اور اس وقت آپ کے چہرے پر انوارات کی ایسی تابانی ہوتی کہ مجھ جیسا کورائے معرفت بھی اس کو محسوس کئے بغیر نہ رہتا، تہجد کے وقت چائے کی پیالی دیکھ کر آپ بہت خوش ہوتے اور اس مبارک اور مستجاب گھڑی میں خوب دعاؤں سے نوازتے۔

ایک دن عصر کی نماز کے بعد مسجد سے قیامگاہ تشریف لے جارہے تھے، آپ کے پیچھے متوسلین کی اچھی خاصی تعداد تھی، احقر

بھیڑ میں پیچھے کی طرف تھا، ایک صاحب نے آپ سے مسئلہ معلوم کیا کہ ''اگر حج بدل کرانے والا اجازت دیدے تو کیا حج بدل کرنے والا حج تمتع کرسکتا ہے،'' آپ نے منع فرمادیا (جیسا کہ معلم الحجاج وغیرہ میں مذکور ہے) وہ صاحب پیچھے کی طرف آئے تو احقر نے ان سے کہہ دیا کہ کرسکتا ہے، انہوں نے آگے بڑھ کر آپ کو میرا جواب بتادیا، آپ نے فرمایا ''بلاؤ بھائی رضی کو!''۔

مجھے ان صاحب کی اس حرکت پر شدید غصہ آیا اور اپنی بے وقوفی پر افسوس، اور یقین ہوگیا کہ آج ضرور سرزنش ہوگی، مگر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ آپ اس گستاخانہ بے اصولی پر قطعاً ناراض نہ ہوئے، بلکہ مجھ سے حوالہ معلوم کیا، میں نے احسن الفتاویٰ کے حوالے سے مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ کی بیان کردہ گنجائش کا تذکرہ کیا، تو آپ نے ان صاحب کو بلوایا اور مذکورہ صورت میں حج تمتع کی اجازت دیدی۔

ناچیز نے تین یا چار سال آپ کو تراویح میں قرآن کریم سنایا، ایک مرتبہ جب کہ مجھے دہلی میں رمضان گزارنا تھا، آپ نے باصرار تراویح کے لئے کاندھلہ بلوایا، معتکف میں جہاں علماء اور صلحاء کی ایک تعداد ہوتی، بیان کے بعد ناچیز ہی سے دعا کرواتے۔

ایک مرتبہ مدرسہ گنبدان پانی پت کی ماہانہ مجلس کے موقع پر تہجد میں مجھے بلوایا، شدید سردی کا زمانہ تھا اور اس وقت آپ کے سامنے ابلے ہوئے انڈے اور گرم گرم چائے رکھی ہوئی تھی، آپ نے ان دونوں چیزوں سے ضیافت کی اور فرمایا کہ ''آپ کو فجر کے بعد ذکر اور صحبت کی اہمیت پر پندرہ منٹ بیان کرنا ہے'' میں نے احتیاطاً استفسار کیا کہ اگر بیس منٹ ہوجائیں تو اس میں کوئی حرج تو نہیں فرمایا کہ ''پچیس میں حرج ہے''۔

آپ کے دعوتی واصلاحی اسفار پنجاب میں سرہند تک ہوتے تھے، ایک مرتبہ ناچیز نے عرض کیا کہ میرا کبھی سرہند جانا نہیں ہوا، ایک مرتبہ آپ کے ساتھ جانے کی خواہش ہے آپ نے میری فرمائش کو قبول کرلیا اور پانی پت کی ماہانہ مجلس سے فارغ ہوکر وہیں سے سرہند کے سفر کا نظام بنایا اور اسکو انتہائی خفیہ رکھا تا کہ زیادہ بھیڑ نہ ہو، مگر اسکے باوجود جب راستے میں ایک جگہ رک کر قافلہ کی تمام گاڑیوں کو جمع کیا گیا تو پندرہ سے متجاوز تھیں:

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

سفرِ آخرت:

۲؍جون ۲۰۱۹ء مطابق ۲۷؍رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ بروز اتوار شام پانچ بجکر پچیس منٹ پر علم ومعرفت کا یہ چراغ ہمیشہ کیلئے گل ہوگیا، برصغیر کے دینی افق پر پون صدی تک چمکنے والا یہ ستارہ ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا، آخری دیدار کیلئے معتقدین اور متوسلین کا سیلاب امنڈ پڑا، کاندھا دینے والوں کے ہجوم کی وجہ سے ہر انتظام اور ہر تدبیر ناکافی ہورہی تھی، بالآخر اس ''میر کارواں'' کو لاکھوں سوگواروں نے باچشمِ پرنم وبا دلِ پرغم خاندانی قبرستان واقع مدرسہ سلیمانیہ، عیدگاہ، کاندھلہ میں اسلاف کے پہلو میں سپرد خاک کردیا:

مثل ایوان سحر، مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

''ان العين لتدمع، وان القلب ليحزن، ولا نقول الا ما يرضى ربنا، وانا بفراقك لمحزونون''۔

ناچیز نے ان اوراق میں جو کچھ نقوش وتأثرات پیش کئے ہیں؛ بلاشبہ آپ کے کمالات کے تئیں ان کی حیثیت ایک 'اشارہ' کی ہے 'احاطہ' کی نہیں:

ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

❁❁❁❁

رہنمائے طلبہ

طلبہ تحریک کے کامیاب تجربات

انجینئر مصطفیٰ محمد طحان.........ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی بھٹکل، کرناٹک

طلبہ تحریک سے منسلک اوراس سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ کمیت کے اعتبار سے چھوٹے اور وسائل و صلاحیتوں کے اعتبار سے اس عظیم معاشرے پر منفی اثرات ڈالنے اوراس کے بلند مقاصد سے اس کو منحرف کرنے کی کوشش کرنیوالے بہت سے خارجی دباؤ سے اس کو واسطہ پڑتا ہے۔

اسی وجہ سے طلبہ تحریک میں کام کرنے والوں پر ضروری ہے کہ ہمیشہ مقصد اور وسیلہ کے درمیان فرق کرے۔

ہدف ومقصد سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی تکمیل محدود زمانے میں کی جاتی ہے، طلبہ تحریک کا مقصد طلبہ برادری کے ساتھ تعلق بنانا ہے۔

وسیلے سے مراد وہ چیز ہے جس کی تکمیل محدود زمانے میں کی جاتی ہے، طلبہ تحریک کا مقصد طلبہ برادری کے ساتھ تعلق بنانا ہے۔

وسیلے سے مراد وہ چیز ہے جس کے ذریعہ ہم مقصد تک پہنچتے ہیں، میدان میں آگے بڑھنے والا اور اقدام کرنے والا ہو یعنی خارجی حالات اور مسلسل دباؤ کی صورت میں اپنے آپ کو حالات کے حوالے کرنے والا اور تھک ہار کر بیٹھنے والا نہ ہو، بلکہ حالات کو اپنے مقصد کے حق میں ہموار کرے اور مکمل تربیت حاصل کرے۔

ہمیشہ مثبت انداز میں کام کرنے والا ہو اور ترقی یافتہ وسائل کو خود سے ایجاد کرنے والا ہو، ان وسائل کو اپنی عقل سے اختیار کرے، اختیار کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ نئے قائدانہ تجربات کو اپنانا ضروری ہے، جو بعد میں آنے والوں کیلئے مشعل راہ اور قابل تقلید نمونہ ہوتے ہیں اور ان ہی کے مطابق اور ان ہی کی روشنی میں منصوبہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔

یہاں سے ہم کامیاب تجربات کی چند مثالیں پیش کررہے ہیں، طلبہ کے میدان میں کام کرنے والا ہر فرد اس کو جوں کا توں نافذ کرسکتا ہے، یا اپنے حالات کے مطابق اس میں تبدیلی بھی کرسکتا ہے، یا اس سے کوئی فکر اور نمونہ حاصل کرسکتا ہے اور اسی کے مطابق اپنے ایجاد کردہ خاص وسائل کو ڈھال سکتا ہے۔

(ا) **آزاد فیڈریشن**:

طلبہ تحریک کو بعض ملکوں میں خصوصاً تیسری دنیا کے ملکوں میں دشوار حالات سے واسطہ پڑتا ہے جو مقاصد کو بروئے کار لانے میں رکاوٹ بنتے ہیں، اس کو کمزور کرنے اور اس کی سرگرمیوں میں کمی لانے اور کبھی کبھار اس کی بیخ کنی کرنے اور اس کے اداروں پر پابندی لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

طلبہ فیڈریشنس طلبہ تحریک کے سرگرم اداروں میں سے ہیں، اسی وجہ سے سب سے پہلے طلبہ فیڈریشنس کو ختم کرنے اور اس کی تحریک کو ماؤف ومشلول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، عام طور پر حکومت طلبہ کے انتخابات میں مداخلت کرتی ہے، امیدواروں کی امیدواری ختم کی جاتی ہے یا ان کو قید کیا جاتا ہے یا انتخابات میں بدعنوانی کی جاتی ہے، یا اس کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے، جسکی وجہ سے فیڈریشن طلبہ کی نمائندگی اوران کے احساسات

وجذبات کو پیش کرنے کے قابل نہیں رہتی، ان حالات میں طلبہ تحریک کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے انجمن کے مقاصد کی تکمیل، طلبہ تحریک کی مدافعت اور اس سلسلے میں تعاون کرنے والے متبادل وسائل تیار کے لئے چستی او رتیزی کے ساتھ کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔

یہ سوچ کیا ہے؟

طلبہ کے آزاد فیڈریشن کا قیام، تاکہ تدریسی عملے کے بعض اراکین کی نگرانی میں بدعنوانی سے پاک انتخابات کا انتظام کیا جائے، اس میں ہر ایک کو امیدواری اور انتخاب کا حق دیا جائے، کوئی بھی اس میں مداخلت نہ کرے، پھر منتخب شدہ افراد طلبہ کے فیڈریشن کی تمام سرگرمیوں کو انجام دیں۔

آزادفیڈریشن کے فائدے اور خصوصیات:

☆ معاشرے کی اہم قدروں میں سے ایک آزادی پر اصرار۔

☆ طلبہ کے دلوں میں متعدد اہم تربیتی معانی کو پیوست کرنا: ظلم کا خاتمہ، آزادی، مثبت امور، شوری اور جمہوریت وغیرہ۔

☆ طلبہ تحریک کے مسائل کو حل کرنے میں تدریسی عملے کو شریک کرنا۔

☆ طلبہ تحریک کے متبادل وسائل کی تیاری۔

☆ طلبہ گروپوں کی تربیت اور طلبہ میں قائدین کی تیاری۔

☆ طلبہ میں اپنے حقوق کے دفاع اور اپنی سرگرمیوں کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا کرنا۔

آزادی فیڈریشن کی خصوصیات:

☆ معاشرے کی اہم قدروں کے طور پر آزادی پر اصرار۔

☆ طلبہ کے دلوں میں اہم تربیتی معانی (ظلم کا انکار، آزادی، مثبت امور، شوری اور جمہوریت وغیرہ) کو پیوست کرنا۔

☆ طلبہ کے مسائل کے حل میں تدریسی عملے کو شریک کرنا۔

☆ طلبہ تحریک کے متبادل وسائل کی تیاری۔

☆ طلبہ کی تربیت اور قیادت کی تیاری۔

☆ طلبہ میں اپنے حقوق کے دفاع کی صلاحیت کو یقینی بنانا۔

اس سوچ کو کیسے نافذ کیا جاسکتا ہے؟:

جس وقت طلبہ تحریک میں کام کرنے والوں کو فیڈریشن کے انتخابات میں مداخلت یا امیدواری کو ختم کرنے یا انتخابات کالعدم قرار دینے یا طلبہ پر اپنے احکام اور ارادوں کو نافذ کرنے جیسے امور سے واسطہ پڑتا ہے، اس وقت ان کوششوں کو بار آور نہ ہونے دینا، طلبہ میں ان کا اعلان کرنا اور حالات کے مطابق ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اگر انتخابات میں دھاندلی کے ذریعہ طلبہ کی نمائندگی نہ کرنے والا فیڈریشن منتخب ہو تو اس کو نہ ماننا اور آزادانہ طور پر انتخاب کرانے کا مطالبہ کرنا ضروری ہے۔

۱- تمام فکری رجحانات اور گروپوں کی نمائندگی کرنے والی طلبہ کی انتخابی کمیٹی تشکیل دینا۔

۲- کمیٹی مندرجہ ذیل امور کے ذریعہ طلبہ کے انتخابات کی تیاری کرتی ہے:

☆ تدریسی عملے میں طلبہ تحریک کے مخالفین اور مؤیدین میں سے متعدد افراد کے ساتھ رابطہ، طلبہ کو اپنے فیڈریشن کے اراکین کے انتخاب میں آزادی دینا، انتخابات کی نگرانی میں شریک ہونے کی ان کو دعوت دینا اور سرکاری انتخابات کے لئے تیار کی جانے والی کمیٹیوں کی طرح کمیٹیوں کی تشکیل۔

☆ اس مسئلے کی تشریح اور اس فکر کی تفصیلات بتانے کے لئے طلبہ میں خطاب کرنا، طلبہ کے آزادانہ انتخابات میں شریک ہونے کے لئے فیڈریشن کی کمیٹیوں میں اپنے امیدواری فارم بھرنے اور انتخابات کے دن ووٹ ڈالنے کی طلبہ کو دعوت دینا۔

☆امیدواری، جانچ، انتخابی مہم اور ووٹنگ کے اوقات اور انتخابات کی تاریخ کی تعیین اور اس کے لئے مناسب جگہوں کی تعیین کے لئے انتخابی کمیٹی تدریسی عملے کے ذمہ داروں کے ساتھ ملاقاتیں کرے، طلبہ کے اس آزادانہ اور بہترین پروگرام کے انعقاد کے لئے سب سے مناسب جگہ یونیورسٹی کے میدان اور گراونڈس ہوتے ہیں۔

☆ انتخابی کمیٹی تمام کاغذی تیاریاں، بیلیٹ پیپرس بکس (ممکن ہوتو شیشے کے بکس تیار کئے جائیں) اور دوسری تیاریاں مکمل کرتی ہے۔

☆امیدواری اور جانچ کے اوقات کا اعلان کیا جائے اور کمیٹی تمام رجحانات کے امیدواروں کے کاغذات قبول کرے اور اخیر میں مختلف کمیٹیوں کے امیدواروں کی آخری فہرست کا اعلان کرے۔

☆انتخابات کے دن کا بہترین انتظام کیا جائے، انتخابات کو کسی بھی مداخلت یا تخریبی کارروائیوں سے بچانا اور اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے، ہر ایک کو آزادی کے ساتھ انتخابی مہم چلانے اور ووٹ کا حق استعمال کرنے کا پورا موقع دیا جائے اور یہ سب کام تدریسی عملے کی نگرانی میں کیا جائے۔

۳-ووٹوں کی چھٹائی کا کام تدریسی عملے کے نگراں حضرات کے تعاون سے طلبہ کی انتخابی کمیٹی اور امیدواروں کے نمائندے انجام دیں، یہ کام اعلانیہ یونیورسٹی کے میدان میں طلبہ کی موجودگی میں ہو۔

۴-آزاد فیڈریشن سرکاری فیڈریشن کے تمام کام انجام دیتی ہے اور اس کے اراکین کو طلبہ میں بڑے احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، ان تمام سرگرمیوں کی انجام دہی کیلئے مالیات کی فراہمی طلبہ اور تدریسی عملے کے چندوں سے ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا امور کو نافذ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں کی طرف توجہ دی جائے۔

☆انتخابات میں مداخلت کی کوششوں کو ناکام بنائیے۔

☆ تمام گروپوں پر مشتمل انتخابی کمیٹی تشکیل دیجئے۔

☆ تدریسی عملے سے رابطہ کیجئے اور ان کا تعاون حاصل کیجئے۔

☆ تمام طلبہ میں مسئلے کی وضاحت کیجئے اور ان کی تائید حاصل کی کیجئے۔

☆ امیدواری کے اوقات اور انتخابات کے دن کا اعلان کیجئے۔

☆مکمل آزادی، کامل غیر جانبداری اور نظم ونسق قائم رکھنے کی کوشش کیجئے۔

(۲) مستقبل کے سرخیل:

طلبہ تحریک میں ہر وقت نئی چیز وجود میں آتی رہتی ہے اور طلبہ تحریک کا کام بڑا مفید ہے، اس میں طالب علم معاشرے کا قائد بننے اور اس کے کاموں کی لیڈرشپ کے لئے تربیت حاصل کرتا ہے، اسی لئے طلبہ تحریک میں کام کرنیوالوں کے لئے قائدین کی تیاری، صلاحیتوں کی دریافت، ان کو ترقی دینے اور ان کی ہمت افزائی کرنے پر ابتدائی سالوں یا ثانوی (سیکنڈری) درجوں میں ہی توجہ دینا ضروری ہے۔

یہیں سے مستقبل کے سرخیل کی سوچ پیدا ہوتی ہے، یہ سوچ کیا ہے اور ہم اس کو کیسے نافذ کر سکتے ہیں؟۔

یہ سوچ کیا ہے؟:

مستقبل کے سرخیل کا مقصد طلبہ تحریک کے تمام میدانوں میں قائدین کی تیاری ہے، جو مستقبل میں یونیورسٹیوں کے اندر طلبہ تحریک کی قیادت کرتے ہیں، اس کے بعد پورے معاشرے میں طلبہ تحریک کی قیادت کے لئے یہ طلبہ فارغ ہوتے ہیں، اس کی

بنیاد ثانوی مدارس (سکینڈری اسکولوں) یا یونیورسٹی کے ابتدائی سالوں میں چند طلبہ کے انتخاب اور طے شدہ منصوبے کے مطابق ان کی تربیت پر ہے، جن کو ایک یا دو سالوں میں پختہ نظام کے تحت طلبہ تحریک کی قیادت کے لئے قابل بھروسہ صلاحیتوں کا مالک بنایا جاتا ہے۔

اس سوچ کو کیسے نافذ کیا جاسکتا ہے؟

۱- طلبہ کے میدان میں کام کرنے والوں، خصوصاً بلند تربیتی تجربات رکھنے والوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے، یہ کمیٹی اس سوچ کی تحقیق کرتی ہے اور مطلوبہ قیادت کی قسموں کی تعیین کرتی ہے، طے شدہ تربیتی اور ثقافتی پروگرام اور نظریاتی مشمولات کے مطابق عملی پروگرام ترتیب دیتی ہے۔

۲- ثانوی مدارس (سکینڈری اسکولوں) کے آخری سالوں یا یونیورسٹی کے ابتدائی سالوں میں طلبہ تحریک کے سرگرم عناصر کو منتخب کرنے کیلئے مختلف کالجس اور ثانوی مدارس میں طلبہ کے قائدین اور تربیت کے ذمہ داروں کے ساتھ مشورے کئے جائیں اور ۳۰ر۴۰ر طلبہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے۔

۳- طلبہ تحریک میں بہترین تجربات رکھنے والے اور بلند تربیتی اور ثقافتی صلاحیتوں کے مالک نگرانوں کا انتخاب کیا جائے اور طے شدہ تربیتی اور ثقافتی منصوبے کے مطابق ان افراد کی تربیت کی جائے۔

۴- طلبہ کو نگرانوں میں تقسیم کیا جائے، ہر نگراں کے پاس چار سے سات طلبہ ہوں، اس طرح یہ تربیت کا ایک گروپ بن جائے گا۔

۵- پروگرام کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے، عام پروگرام، جس میں تمام طلبہ اور نگراں شریک ہوتے ہیں، عام طور پر یہ پروگرام محاضرات، اجتماعات، عملی پروگراموں، دوروں اور کیمپوں وغیرہ کی شکل میں ہوتے ہیں، دوسرا پروگرام مخصوص ہوتا ہے، یہ پروگرام ہر تربیتی گروپ میں علیحدہ ہوتا ہے، اس کا ذمہ دار گروپ کا نگراں ہوتا ہے۔

۶- وقت بوقت نگراں حضرات پروگرام کے نفاذ کا جائزہ لینے اور کسی خامی وکمی کی صورت میں تبدیلی اور اصلاح کرنے کے لئے اس کیلئے بنائی گئی کمیٹی کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں، پھر ایک یا دو سال مقررہ مدت کے اختتام پر تجربات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

(۳) ادبی، فکری اور سیاسی مراکز:

طلبہ کا شمار مہذب اور متمدن افراد میں ہوتا ہے بلکہ یہ حکومت میں اور اس کا مستقبل بنانے والے افراد میں سرفہرست رہتے ہیں، طلبہ تحریک میں کام کرنے والے افراد چاہیں یا نہ چاہیں، بہت سے فکری، ثقافتی، ادبی اور سیاسی مناقشے یونیورسٹی کے تمام کمروں اور شعبوں میں افراد اور گروپوں کے درمیان ہوتے رہتے ہیں۔

اسی وجہ سے طلبہ تحریک میں کام کرنے والے افراد کو مناقشے کی روح بڑھانے، افکار وخیالات اور تہذیب وثقافت میں گہرائی پیدا کرنے، ادبی کاوشوں میں حصہ لینے، سیاسی زندگی میں شریک ہونے اور اس کے مقاصد کا تجزیہ کرنے کی طرف توجہ دینا ضروری ہے، ورنہ طلبہ تحریک اپنی فکری، ثقافتی، ادبی اور سیاسی گہرائی کھو دیتی ہے، یہیں سے ادبی اور فکری مجالس کی سوچ پیدا ہوتی ہے، یہ سوچ کیا ہے اور اس کا نفاذ کیسے ممکن ہے؟۔

یہ سوچ کیسے ممکن ہے؟

اس سوچ کی بنیاد مناقشے کے مواقع فراہم کرنے پر ہے، طلبہ آپس میں یا مثقفین اور ماہرین، مؤلفین اور معاشرے کے قائدین کے ساتھ افکار وخیالات کا تبادلہ کرتے ہیں۔

ان مراکز کی خصوصیات اور فوائد:

مناقشہ اور تبادلہ خیال کے لئے طلبہ کی ہمت افزائی کرنا اور ان کو مناقشے کے آداب وفنون کی تعلیم دینا۔

طلبہ تحریک کے ثقافتی، ادبی اور فکری رول کو سرگرم وفعال بنانا۔

طلبہ تحریک پوری سرگرمی کے ساتھ سیاسی زندگی میں حصہ لے۔

طلبہ کی طرف سے طلبہ تحریک کے قائدین کے ساتھ رابطہ اوران کے ساتھ تبادلہ خیال۔

ایک پہلو سے طلبہ اور ان کے قائدین کے درمیان اور دوسرے پہلو سے معاشرے کے قائدین، مثقفین وماہرین اور طلبہ کے درمیان تبادلہ خیال کے لئے پروگراموں کا اہتمام کیا جائے۔

ضرورت کے وقت طلبہ تحریک کے متبادل وسائل کی تیاری۔

اس سوچ کو کیسے نافذ کیا جاسکتا ہے؟

۱-طلبہ کے میدان میں کام کرنے والے اور خصوصاً ان میں سے مختلف ادبی، فکری، سیاسی ورزشی اور علمی پہلوؤں پر توجہ دینے والوں پر مشتمل ان مراکز کی ایک الگ کمیٹی تشکیل دی جائے۔

۲- یہ کمیٹی منصوبہ بناتی ہے اوراس کے نفاذ کی نگرانی کرتی ہےاوراس کا جائزہ لیتی ہے۔

۳-ان مراکز کے ذریعے کام کئے جانے والے میدانوں کی تعیین کی جائے، جوادبی، فنی، علمی، فکری، سیاسی اورورزشی وغیرہ میدانوں پر مشتمل ہوسکتے ہیں۔

۴-ہر مرکز کا الگ ذمے دار متعین کیا جائے، سب ذمہ دار کاموں کا منصوبہ تیار کرنے کے لئے جمع ہوں، مرکز کی میٹنگوں، مدعوئین کی نوعیت، میٹنگوں کے موضوعات، محاضرین کے نام، میٹنگوں کے مناسب اوقات اوران میٹنگوں کے درمیان مناسب وقفہ (بریک) وغیرہ کے لئے اس منصوبہ کا سالانہ پروگرام پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔

۵-اس طرح کے مراکز کیلئے مناسب جگہوں کا انتخاب کیا جائے، طلبہ یا تدریسی عملہ کے گھروں یا کلبوں یا ہوٹلوں یا بعض جمعیات یاپارٹیوں کے دفتروں میں یہ مجلسیں منعقد کی جاسکتی ہیں۔

۶-انفرادی دعوتوں کے ذریعے یا کالجس اور یونیورسٹیوں میں اعلان چسپاں کران مراکز میں طلبہ کوشریک ہونے کی دعوت دی جائے۔

۷-ان مراکز کی رہنمائی، ان میں سرگرمی لانے، مناقشہ اور تبادلہ خیال کی فضا بنانے اور طلبہ تحریک کے افکار کے ساتھ ہم آہنگی رکھنے والے طلبہ سے واقف ہونے، ان کی رہنمائی کرنے اور طلبہ تحریک میں ان کو سرگرم کرنے کے لئے طلبہ تحریک کے قائدین اور گروپوں کو ان مراکز میں شریک کرانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

۸- افکار وخیالات کو پیش کرنے کے لئے تمام شرکاء کو یکساں موقع دینا اور مرکز کی میٹنگ میں آزادی اور جمہوریت کا تحفظ بھی ضروری ہے، مرکز کے قائداوراس کے منتظم کو تبادلہ خیال کے آداب کو برقرار رکھنے اور صحیح رخ پراس کو لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے، اسی طرح ہر میٹنگ میں طے شدہ امور کا خلاصہ بیان کرنے اور آخری میٹنگ میں واضح انداز میں اس کے اجزاء کی کوشش کرنی چاہیے۔

۹-وقت بوقت تجربات کا جائزہ لیا جائے اورکسی خامی اور کمی کی صورت میں تبدیلی کی جائے اور آئندہ سالوں کے لئے اس میں بہتری لائی جائے۔

تجزیہ

ٹیپو سلطان کا ہندوؤں کے ساتھ حسن سلوک

جناب موسیٰ خان صاحب

۲۰ رنومبر ۱۷۵۲ء کو پیدا ہونے والے شیر ہندوستان، ابوالفتح فتح علی ٹیپو سلطان صرف ایک بہادر سپاہی ہی نہیں بلکہ ایک خوددار، دور اندیش اور انصاف پسند حکمراں تھے، بادشاہ ہونے کے باوجود، جب سے ہوش سنبھالا نہ کسی کو جھک کر سلام کیا اور نہ کسی سے جھک کر سلام لیا، کائنات کا رب ایک ہی ہے، وہی سب سے بلند و برتر اعلیٰ ہے، اور تمام انسان مساوی ہیں ان میں اونچ نیچ کا بھید بھاؤ نہیں، اس بات پر ان کا عقیدہ تھا، اس لئے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی اپنے دربار میں جھک کر سلام کرنے کا رواج بند کرادیا، ٹیپو سلطان مذہبی آدمی تھے مگر مذہبی جنون نہیں، اس لئے ان کی حکومت میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مذہبی آزادی دی گئی تھی، انگریز مؤرخ جے کے مرے نے اپنی کتاب Memories of the Latewar میں ۱۷۸۳ء میں میسور میں قید انگریز قیدیوں کے حالات درج کئے ہیں، ان میں سے ایک قیدی جیمس آسکری کہتا ہے کہ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان ہندوؤں کے مذہبی تہواروں میں بذات خود شریک ہوکر ہندوؤں کے مذہبی مقامات کے لئے دونوں ہاتھوں سے امداد کیا کرتے تھے، نواب حیدر علی نے تو امداد کے علاوہ سری رنگا پٹم میں ''سری رنگ ناتھ'' کا عالیشان مندر بھی تعمیر کروایا تھا۔

۱۹۶۸ء میں منعقد Indian Historical Record کانفرنس میں بنگلور کے مؤرخ ڈاکٹر کے این وی شاسرتی نے تاریخی دستاویزات بطور ثبوت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ حیدر علی نے ٹیپو سلطان کو نصیحت کی تھی کہ میسور ہماری مادر وطن ہے، اپنا فرض سمجھ کر گائے اور ہندوؤں کی حفاظت کرنا، مندر و مسجد میں امتیاز نہ کرنا اور ہر عبادت گاہ کا مساوی احترام کرنا، ٹیپو سلطان نے میسور میں دی گئی تمام جاگیروں کو ضبط کر کے حکومت میں ضم کر دیا تھا مگر ہندو مذہب کے مندروں، عبادت گاہوں اور عطیات و انعامات کو ہاتھ تک نہ لگایا، ٹیپو سلطان نے کبھی ہندو یا عیسائی مذہب سے نفرت نہیں کی بلکہ انہوں نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ ہندو رعایا کے لئے حکم جاری کیا تھا کہ اپنے آباء واجداد کا ہندو مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار نہ کریں، اسی طرح گوا کے عیسائی مذہب کے اہم پیشوا کو خط لکھ کر یہ درخواست کی تھی کہ ''اپنے کچھ پیشواؤں کو میسور روانہ کر دیجئے کیونکہ یہاں کے چند عیسائی اپنی مذہبی تہذیب سے دوری و کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں''۔

قدیم ہندوستان میں دیوی دیوتاؤں کے سامنے انسانی بلی چڑھانے کی رسم چلی آرہی تھی لیکن ٹیپو سلطان نے اپنے دور حکومت میں اس مذموم رسم کو سختی سے بند کروادیا، ۱۷۸۶ء میں پیشوا اور نظام نے ملک میسور پر چڑھائی کی، اس وقت پونے کے پیشوا اور سرداروں کی عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں، اس جنگ میں ٹیپو سلطان نے دشمنوں کا منہ توڑ جواب دیا، جس کی وجہ سے دشمنوں کے چھکے چھوٹ گئے اور فوج کے اعلیٰ عہدیدار میدان چھوڑ کر بھاگ گئے، یہاں تک کہ اپنی عورتوں کی خیر خبر بھی نہ لی اور فرار ہوگئے۔

کثیر تعداد میں مال غنیمت اور شاہی خاندان کی عورتیں ٹیپو سلطان کے ہاتھ لگیں، لیکن ٹیپو سلطان نے ان خواتین کی حفاظت کی اور اپنے خیمے سے قریب انہیں آزادانہ ماحول عطا کیا اور انہیں قیمتی تحائف، عطیات اور شاہی کپڑے عطا کر کے پالکی میں بٹھا کر مسلح دستہ کی حفاظت میں پونہ کے پیشوا کے دربار میں واپس بھجوادیا، تاریخ کے

اوراق میں ایسے واقعات بہت کم ملتے ہیں۔

پیشواؤں کے پھوٹ ڈالنے کی وجہ سے مراٹھا حکومت کے دوٹکڑے ہوگئے تھے اوراسی سے پورے پیشوائی کا جنم ہوا، پونہ کے پیشوا اور ٹیپو میں ہمیشہ جنگی واقعات رونما ہوئے تھے، ۱۷۹۱ء میں میسور کی تیسری جنگ کے دوران پھر سے پیشوا اور نظام نے مل کر چڑھائی کی، پیشوائی فوج کا سپہ سالار''پیشواپرشورام'' تھا، اس کی قیادت میں اس فوج نے شرنگیری مٹھ میں گھس کر پجاریوں کا قتل عام کیا،عورتوں کی آبرو ریزیاں کیں، شاردا دیوی کی مورتی کا استحصال کیا اورمٹھ میں موجود جواہرات، روپیہ اور مویشی لوٹ کرفرار ہوگئے، اس لوٹ میں شرنگیری مٹھ کوساٹھ لاکھ سے زائد نقصان برداشت کرنا پڑا، اس وقت ٹیپو سلطان نے اس مٹھ کے نقصان کی تلافی کرتے ہوئے مٹھ کے منتظمین کو خط لکھا کہ''ہم مجرموں کوضرورسزادیں گے''اس کے بعد ایسے واقعات دوبارہ نہ پیش آئیں، اس وجہ سے مندر کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کیا اور ایک فوجی دستہ وہاں متعین کیا۔

مشہور ومعروف مؤرخ، سابق رکن اسمبلی ڈاکٹر وشومبر ناتھ پانڈے اپنی کتاب Islam and Indian Culture میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۲۸ء میں جب وہ الہ آباد کے کمشنر تھے، اس وقت ایک تاریخی کتاب میں پڑھا تھا کہ دوتین ہزار برہمنوں نے ایک ساتھ خودکشی کرلی کیونکہ ٹیپو سلطان انہیں جبراً مسلمان بنانا چاہتا تھا، اس پر انہوں نے کتاب کے مصنف کو بیسوں خطوط لکھ کر اس کے متعلق استفسار کیا۔

مصنف نے جوابی خطوط میں لکھا کہ یہ واقعہ میسور گیزٹیئر سے لیا گیا ہے؛لیکن میسور گیزٹیئر کے مدیر سری کانیتا نے جواب دیا کہ میسور گیزٹیئر میں اس قسم کا کوئی واقعہ درج نہیں ہے، تاریخ کا طالب علم ہونے کے ناطے میں اس بات کی وضاحت کرتا ہوں کہ ٹیپو سے متعلق یہ سراسر جھوٹ گڑھا گیا ہے کیونکہ ٹیپو کا وزیراعظم اورفوج کا سردار دونوں برہمن تھے، ٹیپو کا محل مندروں کے درمیان تھا اور ٹیپو روزانہ صبح مندروں میں جا کر وہاں کے انتظامات کا معائنہ کیا کرتا، علاوہ ازیں سلطان نے ۱۵۶؍مندروں کو بڑے بڑے انعام وعطیات سے نوازا تھا، ثبوت کے طور پر انہوں نے ۳۰؍کنٹر خطوط کی فوٹو کاپیاں روانہ کی تھیں، ان تاریخی خطوط کو دیکھ کر ڈاکٹر وشومبر ناتھ پانڈے نے سلطان مخالف رقم زہریلی سطور کو کتاب سے خارج کرنے کی حکومت سے مانگ کی تھی لیکن حکومت کا خاموش رویہ دیکھ کر وہ افسردہ رہ گئے، سری رنگا پٹم میں فرنگیوں کے ساتھ آخری معرکہ میں سلطان کے خلاف پونہ کے پیشوا اور حیدرآباد کے نظام نے انگریزوں کا ساتھ دیا اوراسی خونریز معرکے میں ۴؍مئی ۱۷۹۹ء کو سلطان کو شہادت نصیب ہوئی، ٹیپو سلطان کی عظمت کے متعلق آر ایس ایس کے بزرگ لیڈر رآرم لکھانی کہتے ہیں:''اپنی جان بچانے کی خاطر فرنگیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر سلطان کسی پناہ گزیں بادشاہ کی طرح زندگی گزار سکتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو آج ٹیپو کی نسل کو کلکتہ کی سڑکوں پر دھول کھاتے ہوئے، آٹو رکشہ چلا کر پیٹ بھرنے کی نوبت نہ آتی؛لیکن اس خوددار اور غیور حکمراں نے انگریزوں کی غلامی پر شہادت کو ترجیح دی اور جام شہادت نوش فرمایا، اور اپنے ہی قول''گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے'' کو سچ کر دکھایا، اٹھارہویں صدی کے حکمرانوں میں صرف ٹیپو سلطان ہی ایسے بہادر سپاہی ہیں جنہوں نے اپنے مادر وطن کی خاطر فرنگیوں سے لڑتے ہوئے شہادت کو پسند فرمایا، آزاد بھارت کے شہری اس شیر کو سلام کرتے ہیں۔

ٹیپو سلطان اور حیدرعلی مذہبی ضرور تھے، مذہبی جنون نہیں تھا؛لیکن فرقہ پرست مصنّفین نے انہیں مذہبی جنونی قرار دیکر ان کی صاف شفاف شبیہ کو گدلا کرنے کی سازش کی ہے، تاریخ کے اوراق کو ناپاک کرنے کا کام سب سے پہلے انگریزی مؤرخوں نے کیا اور دیسی شاگردوں نے پروان چڑھایا، ان فرقہ پرست مصنفوں نے خصوصاً ٹیپو سلطان اور اورنگ زیب کو نشانہ بنا کر بدنام کرنا چاہا؛لیکن شکر ہے کہ آج بھی ڈاکٹر تاراچند، ہربنس کھیار، رومیلا تھاپر، اوم پرکاش پرساد، وشومبر ناتھ پانڈے، مولانا شبلی اور محمودالرحمٰن بنگلوری جیسے حقیقت پسند مؤرخین کی سچی کاوشوں کی بدولت حقائق کی صحیح تصاویر سامنے آرہی ہیں۔

حسین یادیں

آہ! مولانا عبدالواجد صاحب ندویؒ

حمیداللہ قاسمی کبیرنگری

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں، موت کے آنے کا کوئی وقت بھی متعین نہیں، موت کے لئے عمر کی بھی کوئی قید نہیں، موت فرمانِ خداوندی کا ایک ایسا الارم ہے کہ جس کے بجنے کیلئے بس خدا کے فرمان کا انتظار رہتا ہے، جب خدا کا فرمان آجاتا ہے تو بندہ اپنے رب کی طرف روانہ ہوجاتا ہے، اب چاہے وہ اپنی عمر کے کسی بھی مرحلے میں ہو، بچپن میں ہو، جوانی میں ہو یا بڑھاپے میں، بہرحال موت کا جب وقت آجاتا ہے، تو نہ وہ ایک منٹ کو آگے ہوتی اور نہ ایک منٹ پیچھے ہوتی ہے، جس کا نقشہ قرآن کریم نے یوں کھینچا ہے:"اِذَا جَـاءَ اَجَـلُهُـمْ لَايَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَلَايَسْتَقْدِمُوْنَ"۔

راقم الحروف عیدالاضحیٰ کے موقع پر گھر جانے کے لئے اپنی تیاری میں مصروف تھا اور مرکز کے کاموں کو جلدی جلدی پورا کر رہا تھا کہ اچانک ہمارے ادارہ کے بانی وناظم مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی کا فون آیا کہ مولانا عبدالواجد رشیدی ندوی کے انتقال کی خبر آئی ہوئی ہے، مجھے تحقیق کرکے بتاؤ؟ (چونکہ مفتی صاحب ان دنوں بیرونی سفر پر تھے) راقم فوراً جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ میں اپنے دوست اور کرم فرما مولانا محمد ساجد صاحب قاسمی سے رابطہ کیا، معلوم ہوا کہ بات سچ ہے اور ابھی کچھ دیر پہلے مولانا عبدالواجد صاحب کو اٹیک پڑا اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے، یہ خبر سنتے ہی بدن میں کرنٹ جیسا لگا، کلیجہ دھک سے کرکے رہ گیا، اس خبر نے ذہن ودماغ کو ماؤف اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا، استرجاع کے الفاظ پڑھنے کے بعد اپنے ماضی کی یادوں میں کھوگیا، ان کی پیاری صورت اور بھولی بھالی سیرت ذہن میں گردش کرنے لگی، ان کا مرکز میں آنا جانا یاد آنے لگے، فون پر ان سے دیر تک باتیں کرنا سب کچھ یاد آنے لگا، مولانا ابھی جوانی کی وادیوں میں قدم رنجہ ہوئے تھے، ابھی عنفوان شباب کے مرحلہ کو اطمینان وسکون کے ساتھ طے کررہے تھے کہ صدائے غیبی نے آواز لگادی:"يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىْ اِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً" چنانچہ اپنی عمر بھر کی نیکیوں اور علمی خدمات کا صلہ پانے کیلئے ۵/ذی الحجہ ۱۴۴۰ھ مطابق ۷/اگست ۲۰۱۹ء بدھ کے روز اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہوگئے: ؎

دنیا نہیں ہمیشہ کسی کی قیام گاہ
جو ہے یہاں وہ تیر قضا کا نشانہ ہے

مولانا عبدالواجد صاحب ندوی ایک بافیض مخلص انسان تھے، علم پرور اور علم دوست تھے، جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کے ممتاز معلم اور مولانا محمد ساجد صاحب قاسمی کھجناوری کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ ''صدائے حق'' گنگوہ کے معاون مدیر، عوام وخواص کے درمیان مقبول وہردلعزیز اور حضرت مولانا خالد سیف اللہ قاسمی نقشبندی کے دست راست اور معتمد تھے۔

راقم کا مولانا عبدالواجد صاحب ندوی سے ایک گہرا اور والہانہ تعلق تھا، مولانا جب بھی مظفرآباد آنے کے لئے تیاری کرتے تو پہلے راقم کے پاس فون کرتے اور صورت حال دریافت کرتے پھر یہاں تشریف لاتے، راقم بھی ان کی آمد سے خوش

ہوتا، کبھی تنہا آتے اور کبھی ساتھ میں اپنے پیارے لاڈلے کو بھی لاتے، مولانا کو دیکھتے ہی ایسا لگتا تھا کہ شاید وہ دنیا کے جھمیلے سے بالکل آزاد تھے، متفکر اور غمزدہ کبھی بھی نہیں دیکھا، جب بھی دیکھا چہرے پر مسکراہٹ اور خوشی کے آثار ہی دیکھے، ان کی چلت پھرت زندگی ایک مثالی زندگی تھی، علم وعمل اور اخلاص وللّٰہیت کے پیکر تھے، متحرک اور فعال ہونے کے ساتھ ساتھ منکسر المزاج تھے، ہمیشہ اور ہر وقت یادالٰہی میں رطب اللسان رہتے تھے، شکر خداوندی کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، دینی خدمات کے ساتھ انہوں نے تجارت سے بھی دلچسپی رکھی اور مختلف مدارس کے لئے کتابیں اور کاپیاں چھپوایا کرتے تھے، ہمیشہ کی طرح امسال بھی مرکز کے لئے انہوں نے کافی مقدار میں ''عزیزی کاپی'' کے نام سے کاپیاں چھپوائی تھی، جس کے سلسلہ میں کئی بار راقم نے فون پر ان سے رابطہ کیا، تو معلوم ہوا کہ ابھی تیار نہیں ہوئی ہیں۔

انتقال سے دو تین روز قبل راقم نے مولانا کو فون کیا؛ لیکن مولانا نے فون ریسو نہیں کیا، ایک گھنٹہ کے بعد انہوں نے ازخود فون واپس کیا اور کہنے لگے مولانا حمیداللہ صاحب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، دراصل باہر سے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے ان میں الجھ رہا تھا اور آپ کے فون کا جواب نہ دے سکا، آپ کی کاپیوں کا کام ہوگیا ہے، میں نے ان سے کہا کہ وہ کہاں پر رکھی ہوئی ہیں، انہوں نے اس آدمی کا نمبر اور جگہ کا نام بھی واٹس اپ پر بھیجا، جہاں پر کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔

مولانا عبدالواجد صاحب کا اتنی جلدی سے دنیا کو الوداع کہنا اور آخرت کو سدھار جانا جہاں ان کے اہل تعلق، رشتہ داروں، یتیم بچوں اور ان کی اہلیہ کے لئے شاق گزر رہا ہے، وہیں پر راقم کے لئے بھی بڑی دکھ اور تکلیف کا باعث ہوا ہے، چونکہ مولانا بے تکلف دوستوں میں سے تھے، جب بھی کوئی بات ہوتی تو بلا جھجھک پوچھتے اور کہتے، زبان سے نہ کسی کی برائی، نہ کسی کی ملامت، نہ کسی کو لعن طعن بس اپنے کام سے کام، جب بھی فون کرتے تو بڑے اطمینان کے ساتھ بات کرتے، ان کے یہاں جلد بازی کا تصور عنقاء تھا، ہر کام سکون واطمینان سے انجام دیتے، انہوں نے کتابوں کی طباعت واشاعت کا بھی بیڑا اٹھا رکھا تھا، جس کی خاطر انہوں نے ''دارالکتب الاسلامیۃ'' کے نام سے ایک کتب خانہ بھی کھول رکھا تھا، جس کے ذریعہ دینی اور علمی کتابیں شائع کرتے تھے، الغرض مولانا عبدالواجد صاحب ندوی اپنے کارناموں کی وجہ سے اکابر علماء میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔

راقم کا تعلق مولانا عبدالواجد صاحب سے بہت گہرا تھا، مولانا نے گنگوہ آنے کی بارہا دعوت دی؛ لیکن ان کی دعوت پر گنگوہ جانا نصیب نہیں ہوا، راقم ہمیشہ وعدہ کرتا اور بعد میں معذرت کرلیتا، دوسال قبل مہمانوں کے ساتھ گنگوہ جانا بھی ہوا، اتفاق سے مولانا عبدالواجد صاحب سفر پر تھے، اطلاع ملنے پر انہیں بہت افسوس ہوا، مولانا کے اندر مہمان نوازی کی صفت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی، اگر کوئی شخص راقم کے تعلق کا گنگوہ جاتا اور مولانا سے تذکرہ کرتا، یا انہیں معلوم ہوجاتا ہے کہ مولانا حمیداللہ کے آدمی ہیں تو مولانا اس کے اوپر جان فدا کردیتے، گھر سے کھانا منگواتے اور بڑے اہتمام سے کھانا کھلاتے اور اس کو رخصت کرتے، ایسا کئی بار ہوا، ان سب باتوں سے مولانا کی جدائیگی یقیناً دل پر شاق گزر رہی ہے اور گاہے گاہے ذہن ودماغ میں ان کا تصور آتا رہتا ہے، کبھی کچھ خیال آتا ہے تو کبھی کچھ، نہ جانے کس حال ہوگا میرا رفیق، یہ سب چیزیں جب سوچتا ہوں تو گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا عبدالواجد صاحب مجھ سے یہ کہہ رہے ہیں: ؎

بڑے آرام سے ہوں گوشۂ مدفن میں اے ہمدم
سکون قلب سے لبریز پایا ہے، یہ گھر میں نے

اصلاحیات

مسجدوں کے آداب ومستحبات

محمد مسعود عزیزی ندوی

یہ مضمون دراصل راقم کا ایک بیان ہے، جو۲۲؍مارچ ۲۰۱۲ء بروز جمعہ مرکز کی جامع مسجد میں نمازیوں کے سامنے ہوا، اس کی افادیت کے پیش نظر قارئین کی نذر کیا جارہا ہے۔

مسجد اللہ کا گھر ہے :

دینی بھائیو! ہم لوگ جس جگہ پانچ وقت اللہ کی عبادت کرتے ہیں،نماز پڑھتے ہیں،اس کو مسجد کہتے ہیں،اس کو اللہ کا گھر کہتے ہیں،اس کے کچھ آداب ہیں، ہر چیز کے کچھ اداب ہوتے ہیں،اگر ان آداب کو انسان اختیار کرلیتا ہے اور ان کی روشنی میں اس عمل کو انجام دیتا ہے تو اس کے اندر چار چاند لگ جاتے ہیں، اس کے اندر بہترائی پیدا ہوجاتی ہے اور اللہ کے یہاں بھی وہ عمل مقبول ہوتا ہے،ہم لوگ اللہ کے گھر میں عبادت تو کرتے ہیں،مگر مساجد کا، اللہ کے گھروں کا خیال نہیں کرتے، ان کا ادب نہیں کرتے یعنی وہاں پہنچ کر دنیا کی باتیں کرتے ہیں، گپ شپ کرتے ہیں اور غیر ضروری باتیں اللہ کے گھر میں کرتے ہیں اور خیال تک نہیں ہوتا۔

مسجد میں باتیں کرنا:

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ نماز سے پہلے مسجد میں آگئے، دس یا پانچ منٹ جماعت کھڑی ہونے میں باقی ہیں،اگر سنت پڑھی تو پڑھی اور اگر نہیں پڑھی تو نہیں پڑھی،نماز میں دس پندرہ منٹ باقی ہیں،ایک مسلمان آتا ہے، دوسرے مسلمان کے پاس بیٹھ جاتا ہے، بازار کی باتیں کرتا ہے،کھیت کی باتیں کرتا ہے اور رشتہ داری کی،لڑائی جھگڑے کی،شہر کی اور محلّہ کی باتیں کرتا ہے، اگر گاؤں میں یا کہیں کوئی واقعہ پیش آیا ہے تو اس کی تحقیق مسجد میں کرتا ہے کہ بھائی سنا ہے وہاں ایسا ہوا،ہاں بھائی کیا ہوا؟ اس کو بھی دلچسپی پیدا ہوتی ہے کہ بھائی کیسے؟ کہ ہاں ایسے، بس وہ سنانی شروع کردیتا ہے، یہاں تک کہ جماعت کا ٹائم ہوجاتا ہے۔

مسجد میں کیا کرنا چاہئے:

حالانکہ اس کو یہ چاہئے تھا کہ وہ اللہ کے گھر میں آیا،نماز میں دس پندرہ منٹ باقی ہیں،مسجد میں آ کر تحیۃ المسجد یا تحیۃ الوضو پڑھتا یا نماز کی سنتیں پڑھتا،اس کے بعد اگر وقت ہے تو قرآن کریم کی تلاوت کرتا، یا اللہ کا ذکر کرتا، استغفار کی تسبیح کرتا، تیسرے کلمہ کی تسبیح کرتا، درود شریف کی تسبیح پڑھتا،کوئی بھی اللہ کا ذکر کرتا کہ اس کا وقت صحیح مصرف میں استعمال ہوجاتا اور وہ غیر ضروری باتوں میں ملوث نہ ہوتا،اس لئے کہ وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہے۔

مسجد میں باادب بیٹھنا چاہئے:

ہم لوگ دنیا میں کسی کی مجلس میں شریک ہوتے ہیں، کسی بزرگ کی مجلس میں شریک ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ایک استاذ کے پاس بیٹھتے ہیں، یا ابا کے پاس بیٹھتے ہیں،تو اگر ان کے پاس بیٹھ کر ہم اپنی گفتگو شروع کردیتے ہیں تو ان کو برا لگتا ہے،ان کو بے ادبی محسوس ہوتی ہے کہ دیکھو کتنا نالائق آدمی ہے، استاذ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، حضرت سامنے بیٹھے ہیں اور یہ اپنی باتوں میں مشغول ہے، یا یہ کہ کوئی بڑا افسر،کوئی بڑا آدمی،کوئی بڑا معزز مہمان بیٹھا ہوا ہے، اس کی باتیں نہیں سن رہے ہیں اور اپنی باتوں میں مشغول ہیں، اس کو بھی برا لگتا ہے، لیکن ہم احکم الحاکمین، خالق کائنات کے دربار میں حاضر ہو کر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے،

اس کی باتوں میں اور اس کے ذکر میں مشغول نہیں ہوتے، حالانکہ ہمیں اس کے ذکر وفکر میں، اس کی عبادت میں مشغول ہونا چاہئے تھا۔

مسجد میں بیٹھ کراللہ کیطرف متوجہ ہونا چاھئے:

مسجد میں بیٹھ کر، اللہ کے گھر میں بیٹھ کر، اس کے سامنے بیٹھ کر دنیاوی خرافات میں مشغول رہتے ہیں، دنیا کی باتوں میں مشغول ہوتے ہیں، کتنی بے غیرتی کی بات ہے، کتنی شرم کی بات ہے، اگر آدمی سوچے اور محسوس کرے کہ ہم کس کے دربار میں بیٹھے ہوئے ہیں، کس آقا کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، اس کا تو خیال کریں، اس کے گھر کا تو خیال کریں، ابا کا خیال کرتے ہیں، اپنے استاذ صاحب کا خیال کرتے ہیں، اپنے شیخ ومرشد اور حضرت کا خیال کرتے ہیں، یہاں تک کہ آفیسر، حاکم یا بڑے آدمی کا خیال کرتے ہیں؛ لیکن اللہ رب العالمین کا خیال نہیں کرتے، اس کے دربار میں دنیا کی باتیں کرتے ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا مسجد سے، اللہ سے کوئی تعلق نہیں، صرف وقت گزاری کے لئے ساری باتیں یہیں ہوتی ہیں، بعض لوگوں کو تو بیٹھکوں میں یا کسی اور جگہ وقت نہیں ملتا تو ساری کی ساری چیزوں کی تحقیق یہیں کر لیتے ہیں، مسجد میں ہی بات کر لیتے ہیں، مسجد میں ہی پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔

مسجد اللہ کی عبادت کے لئے ھے:

مسجد اس کے لئے نہیں، مسجد تو اللہ کے ذکر کیلئے ہے، مسجد تو اللہ کی عبادت کیلئے ہے "انما یعمر مساجد اللّٰہ من اٰمن باللّٰہ والیوم الآخر واقام الصلاۃ واتی الزکاۃ ولم یخش الا اللّٰہ" مسجدیں وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور نماز قائم کرتا ہو، زکوۃ دیتا ہو، اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتا ہو، اس لئے یہ مسجدیں نماز پڑھنے کیلئے ہیں، یہ اللہ کی عبادت کرنے کیلئے ہیں، یہاں پر اللہ کا خوف طاری ہونا چاہئے، اللہ کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہونا چاہئے، اللہ کا ذکر ہونا چاہئے، قرآن کریم کی تلاوت ہونی چاہئے، نوافل ہونے چاہئیں، نمازیں ہونی چاہئیں، ذکر واذکار ہونا چاہئے یا پھر دینی باتیں ہونی چاہئیں، غیر دینی، دنیاوی باتیں اللہ کے گھر میں نہیں ہونی چاہئیں، اگر ہم اللہ کے گھر کا خیال رکھیں گے تو اللہ تبارک وتعالی ہم پر فضل فرمائے گا، اور ہماری لاج رکھے گا، ہماری دعائیں قبول ہوں گی کہ ہم نے اس کے گھر کا احترام کیا، اس کے گھر کی عزت کی اور اس کے گھر کو اللہ کا گھر سمجھا تو ہمیں عبادت کا ثواب ملے گا۔

مسجد میں صاف ستھرا ہوکر آنا چاھئے:

اسی طرح مسجد میں صاف ستھرا ہوکر آنا چاہئے، اللہ تعالی فرماتا ہے: "خذو زینتکم عند کل مسجد" کہ نماز کے وقت زینت اختیار کرو، مطلب یہ کہ جب نماز پڑھنے مسجد میں جاؤ، زیب وزینت اختیار کرو، ستر چھپاؤ، صاف ستھرے کپڑے پہنو، اچھے کپڑے پہنو، اس لئے کہ آپ اللہ کے دربار میں حاضر ہو رہے ہیں، اللہ سے ملاقات کیلئے، اللہ سے باتیں کرنے کے لئے جا رہے ہو، بعض لوگ غیر ساتر کپڑا پہن کر آ جاتے ہیں، یا رکوع وسجدہ میں جاتے ہوئے پیچھے سے سرین کے اوپر سے کھل جاتا ہے، بعض لوگ گندے کپڑے پہن کر آ جاتے ہیں، ان کے کپڑوں اور جسم سے بدبو آتی رہتی ہے، پاس کھڑا ہونا مشکل ہو جاتا ہے، تو اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، نہا دھوکر، صاف ستھرے کپڑے پہن کر اللہ کے دربار میں آنا چاہئے۔

مسجد میں منکرات سے بچنا چاھئے:

مسجد میں بیٹھ کر موبائل چلانا، انٹرنیٹ، واٹس اپ چلانا، فیس بک چلانا، گانے چلانا، فحش تصویریں دیکھنا، چاہے موبائل میں چاہے اخبار میں، دنیاوی باتیں کرنا صحیح نہیں ہے، گالی گلوچ

کرنا، لڑنا جھگڑنا، بلند آواز سے گفتگو کرنا، شور شرابہ کرنا، خرید وفروخت کرنا، بھاؤ تاؤ کرنا، ادھر ادھر کی خبریں معلوم کرنا، جاسوسی کرنا، ایک دوسرے کے عیب تلاش کرنا یا عیب بیان کرنا، یہ سب مناسب نہیں ہے۔

مسجد میں کسی عالم سے مسئلہ معلوم کرنا:

بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ فرض نماز سے فارغ ہوتے ہی جیسے ہی امام صاحب سلام پھیرتے ہیں، تو یہ مولانا صاحب کو دیکھتے ہیں اور مسئلہ پوچھتے ہیں، حالانکہ عشاء کی نماز پڑھ کر یا فجر کی یا ظہر کی نماز پڑھ کر سب لوگوں کو اپنے کام میں مشغول ہونا تھا، مثلاً سنتوں میں مشغول ہونا تھا، اب یہ تو مولانا صاحب سے بلند آواز سے مسئلہ دریافت کر رہے ہیں، جب وہ مسئلہ بتائے گا تو سارے نمازی ڈسٹرب ہونگے، حالانکہ اس کا تعلق یا تو اس کی ذات یا اس کی زندگی سے ہے یا عوام سے ہے، یہاں پر دو باتیں ہوئیں ایک تو مسئلہ بتانے کی وجہ سے دوسرے نمازیوں کو جنہوں نے نیت باندھ لی ہے یا جن کو جلدی ہے، حرج واقع ہوگا، دوسرے جس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اس کی توہین ہوگی، تو فوراً ایسے وقت میں مسئلہ معلوم کرتے ہیں، مسئلہ معلوم کریں، تو چپکے سے معلوم کریں یا نماز سے فارغ ہوکر جب سب لوگ چلے جائیں، انتظار میں بیٹھے رہیں اور مولانا صاحب جب مسجد سے نکلیں یا دوسرے سب لوگ مسجد سے جا چکے ہیں، تب مسئلہ معلوم کریں۔

مسئلہ معلوم کرنے میں کسی کی توہین مقصود نہ ہو:

یہ بات ذہن میں رہے کہ مسئلہ معلوم کرنے میں اعتراض نہیں ہونا چاہئے کہ فلاں صاحب نے ایسا کیا تھا، مولانا صاحب آپ کیا بتلاتے ہیں اس بارے میں، کہ ہمارے محلّہ میں فلاں ماسٹر صاحب ہیں، فلاں حاجی صاحب ہیں وہ ایسا کرتے ہیں، شریعت کیا کہتی ہے اس سلسلہ میں، تو مسئلہ تو معلوم کرتا ہے؛ لیکن اس میں اس کی توہین بھی مقصود ہوتی ہے، تو بجائے ثواب کے اس کو گناہ بھی ملتا ہے، اگر مسئلہ معلوم کرنا مقصود ہو تو چپکے سے معلوم کرے، نام نہ ظاہر کرے، یہ کہے کہ اس سلسلہ میں کیا رائے ہے، اس میں کونسا طریقہ صحیح ہے، یا شریعت کا کیا حکم ہے، اگر کوئی آدمی ایسا کرے تو شریعت اس سلسلہ میں کیا کہتی ہے، اللہ کا کیا حکم ہے، قرآن میں کیا حکم ہے، ایسے انداز میں پوچھے، اس کا نام نہ ظاہر کرے، لیکن وہ بے چین اتنا رہتا ہے کہ مسئلہ پورا ہونے سے پہلے ہی کہتا ہے کہ فلاں ایسے کرتا ہے، ہمارے محلّہ میں ماسٹر جی ہیں، ہمارے محلّہ میں پروفیسر صاحب ہیں، ڈاکٹر صاحب ہیں، انجینئر صاحب، یا حافظ صاحب ہیں وہ ایسا کرتے ہیں، تو مسئلہ معلوم کرنے میں بھی ایک تو مسجد کا خیال کریں، نمازیوں کا خیال کریں اور اس مسلمان کا جس کے بارے میں اس کو اعتراض ہے اس کا خیال کریں، چپکے سے معلوم کر کے پھر الگ سے اس کو بتلایا جائے کہ شریعت کا یہ حکم ہے، ایسا کرنا چاہئے، اس طرح اس مسلمان کی عزت بھی بچے گی، اس کی توہین نہیں ہوگی، اللہ کے گھر کی بے حرمتی نہیں ہوگی اور آپ بھی توہین کے گناہ سے بچیں گے۔

بدبودار چیزوں سے مسجدوں کو پاک رکھو:

مسجدوں میں زور سے ڈکاریں لینا یا زور زور سے ریح خارج کرنا یہ مسجد کے آداب کے خلاف ہے، اگر آدمی کھانا کھا کے آیا ہے اور اس کو ڈکار آتی ہے، ظاہر ہے کہ ڈکار میں بدبو ہوتی ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ مسجد میں کوئی بھی بدبودار چیز کھا کر آنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مسجد اللہ کا گھر ہے، یہاں پر اللہ کے فرشتے رہتے ہیں اور اللہ کے فرشتوں کو بدبو سے تکلیف ہوتی ہے، اسی لئے پیاز، لہسن، یا ایسی کوئی چیز کھا کر مسجد میں آنا صحیح نہیں ہے، جائز نہیں ہے جس میں بدبو آتی ہو، اور بیڑی پی کر مسجد میں آنا کہ مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوکر بیڑی پیئے اور پھر مسجد میں داخل

ہوجائے، یہ تو اور زیادہ غلط بات ہے یا یہ کہ مسجد میں آوے اور آ کر خوب زور سے کھنکارے یا منھ سے معدہ کی ہوا خارج کرے، اور جو برابر میں نمازی کھڑے ہوئے ہیں، ان کو بدبو آئے گی، ان کو تو تکلیف ہوگی ہی لیکن اللہ کے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوگی، ڈکار غیر اختیاری چیز ہے، اگر آ جاوئے تو کوشش کریں کہ مسجد سے باہر چلے جائیں، ریح غیر اختیاری چیز ہے، اگر آ جاوے اور مجلس میں ہوں یا مسجد میں تو اس کو روکے نہیں اس سے بیماری پیدا ہوتی ہے، چپکے سے باہر نکل کر پھر ریح خارج کرے، بدبودار چیزوں سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے، ایسے ہی بدبودار چیزوں سے اللہ کے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے، ریح کا نکلنا غیر اختیاری ہے، لیکن یہ نہ سوچے کہ آواز تو آئے گی نہیں کسی کو پتہ نہیں چلے گا؛ لیکن فرشتوں کو تو پتہ چل رہا ہے اور بدبو سے دوسرے بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو بھی پتہ چل جاتا ہے، اس کا بھی خیال کریں، یہ بھی مسجد کے آداب میں سے ہے۔

مسجد کے آداب:

مسجد کے بہت سارے آداب ہیں، ان سب کا خیال کریں، مسجد میں دنیاوی باتیں نہ کریں، مسجد میں غیر ضروری باتیں نہ کریں، انگلیاں نہ چٹخائیں اور ایسی ہر چیز سے بچیں جس سے مصلّیوں کو، فرشتوں کو تکلیف ہو، بیڑی پی کر خاص طور سے نہ آویں، بیڑی اگر پینے والے ہیں، پان تمبا کو وغیرہ کھانے والے ہیں، وہ پہلے سے کلی کر کے تب مسجد میں داخل ہوں، ورنہ بیڑی پینے والے جب مسجد میں برابر میں آ کر کھڑے ہوجاتے ہیں، تو نماز پڑھنی دشوار ہوجاتی ہے، یہ تو ایک انسان کا حال ہے؛ لیکن اللہ کے فرشتوں کو تو اتنی بو آتی ہے، اتنی بدبو آتی ہے کہ اس کی تکلیف مالایطاق ہوجاتی ہے، اتنی ہوجاتی ہے کہ برداشت نہیں ہو پاتی، تو کم از کم انسانوں کا خیال نہ ہو سکے تو فرشتوں کا تو خیال کرنا چاہئے، اور اللہ کے حکموں کو بھی بجا لانا چاہئے، تو مسجد کا خیال رکھیں، اس کا ادب کریں اور اس کا لحاظ کریں، ان چیزوں کا خیال ہر مسلمان کو رکھنا چاہئے، ہم لوگ بے احتیاطی میں اور لاابالی پن میں یہ سب چیزیں کر جاتے ہیں، مسجدوں میں صرف مسائل معلوم کریں، دینی باتیں معلوم کریں، دنیاوی باتوں سے پرہیز کریں۔

مسجد میں دعوت کا انداز:

بعض لوگ جمعہ کے روز جمعہ کی نماز کے بعد جب لوگ مسجد سے نکلنا شروع ہوتے ہیں تو چیخ کر، چلا کر کہتے ہیں کہ بھائی گھروں پر مصلا بچھا رکھا ہے، طنزیہ انداز میں لوگوں کو سنت کے لئے روکا جاتا ہے، تو کوئی بھی نہیں رکتا، اگر محبت سے سمجھا کر کہا جائے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد سنتیں پڑھتے تھے، سنتیں پڑھنا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اگر نہیں پڑھیں گے تو گناہ ہوگا، تو اس طرح سے اگر کہیں گے تو اگر دس جانے والے ہیں، تو کم از کم پانچ تو رک ہی جائیں گے؛ لیکن اگر اس انداز سے، بھونڈے انداز سے کہیں کہ تمہارے گھروں میں مصلی بچھا ہوا ہے، کہاں جا رہے ہو؟ سنتیں نہیں پڑھتے؟ بڑی شرم کی بات ہے، تو ایک بھی نہیں رے گا، محبت و پیار، ہمدردی، اخوت و بھائی چارگی اس کے اندر ہو، پھر دعوت کا پہلو ہو تو ضرور انشاء اللہ اثر ہوتا ہے، اس کے اندر تاثیر ہوتی ہے اور بات میں جب تاثیر ہوتی ہے تو اثر ہوتا ہے، فائدہ ہوتا ہے، یہ چیزیں اختیار کرنی چاہئیں، غیر ضروری باتوں سے احتیاط کرنی چاہئے، اللہ تبارک وتعالی ہم سب کو مسجد کے آداب اختیار کرنے کی، مسجد کا لحاظ کرنے کی، مسجد کا احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مسجد میں اعتکاف کی نیت سے بیٹھنا چاھئے:

اسی طرح جب مسجد میں آئیں تو نیت کر لینی چاہئے اعتکاف کی کہ یا اللہ! میں جب تک مسجد میں رہوں اعتکاف کی نیت کرتا

ہوں "نویت الاعتکاف مادمت فی المسجد" اس کو اعتکاف کا ثواب ملے گا، ہم لوگ پانچوں وقت مسجد میں آتے ہیں، جتنی دیر مسجد میں رہتے ہیں اعتکاف کی نیت کرلیں تو اعتکاف کا ثواب ملے گا، یہ چھوٹے چھوٹے اعمال ہیں، ذراسی نیت کرنے سے، ذراسی توجہ کرنے سے پورا وقت، پوری زندگی عبادت بن جاتی ہے۔

مسجد میں کیسے داخل ہوں:

جب بھی مسجد میں داخل ہوں تو دعا پڑھ کر "اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك" داخل ہوں، دایاں پیر پہلے داخل کریں، اور مسجد میں آکر اگر وقت ہے، تو تحیۃ الوضو، تحیۃ المسجد کی نیت سے دو رکعت پڑھیں اور پھر بیٹھ جائیں اور اگر اتنا وقت نہیں ہے اور آپ نے سنتوں کی نیت باندھ لی، اگر تحیۃ الوضوء، تحیۃ المسجد کی بھی نیت کی تو اس کا بھی ثواب مل جائے گا۔

مسجد سے نکلنے پر آداب وسنن کا لحاظ رکھنا چاہئے:

ایسے ہی مسجد سے نکلتے وقت، جب نکلیں تو دعا پڑھ کر نکلیں "اللّٰھم انی اسئلك من فضلك" اور بایاں پیر پہلے مسجد سے باہر نکالیں، پھر جوتے پہنیں اور پہلے دائیں پیر میں پہنیں، پھر بائیں پیر میں پہنیں؛ لیکن یہاں یہ غلطی ہوتی ہے کہ بایاں پیر مسجد سے باہر نکالتے ہیں اور اسی میں جوتا پہننا شروع کردیتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہئے بلکہ بایاں پیر مسجد سے باہر نکالیں اور دایاں پیر پہلے جوتے کے اندر داخل کریں، یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی چھوٹی سنتیں ہیں، ان کا خیال کریں گے تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہونگے اور ہماری زندگیوں کے اندر دین ہوگا، اللہ تعالی ان تمام آداب کو اختیار کرنے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی کی

اہم تصانیف

۱- مختصر تجوید القرآن (بروایت حفص اردو)
۲- بچوں کی تمرین التجوید (تجوید کے قواعد، مشق اور طریقہ تدریس اردو)
۳- جیب کی تجوید (تجوید کے ضروری قواعد کا پاکٹ سائز مجموعہ)
۴- ریاض البیان فی تجوید القرآن (بروایت حفص عربی)
۵- رہنمائے سلوک وطریقت ۶- مراجع الفقہ الحنفی ومیزاتہا
۷- الامامۃ فی الصلاۃ ومسائلہا واحکامہا ۸- التدخین بین الشرع والطب
۹- حیات عبدالرشید ۲۰۰/روپئے ۱۰- سیرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ
۱۱- تذکرہ مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ ۱۲- تذکرہ علامہ سید سلیمان ندویؒ
۱۳- تذکرہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۴- تذکرہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ۱۵- چند مایہ ناز اسلاف قدیم وجدید
۱۶- مقالات ومشاہدات ۱۷- مکتوبات اکابر
۱۸- چندہ دینے، دلوانے اور لینے کے آداب واصول
۱۹- افکار دل (۳۰/تقریروں کا مجموعہ) ۲۰- مدارس کا نظام تحلیل وتجزیہ
۲۱- تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ
۲۲- سیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ۲۳- لڑکیوں کی اصلاح وتربیت
۲۴- ملفوظات حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ
۲۵- میری والدہ مرحومہ (نقوش وتأثرات)
۲۶- قادیانیت نبوت محمدیؐ کے خلاف بغاوت
۲۷- تذکرہ حضرت حافظ عبدالرشید رائے پوری
۲۸- نقوش حیات حضرت مولانا عبدالرحیم متالا ۲۹- تصوف اور اکابر دیوبند
۳۰- امامت کے احکام ومسائل ۳۱- اللہ ورسول کی محبت
۳۲- فقہ حنفی کے مراجع اور ان کی خصوصیات ۳۳- عقائد اور ارکان اسلام
۳۴- ماں باپ اور اولاد کے حقوق ۳۵- میرے شیخ ومرشد مفکر اسلام
۳۶- القادیانیة ثورة علی النبوة المحمدیة ۳۷- سیرة النبی الأکرم
۳۸- درد دل ۳۹- ساز دل ۴۰- حیات شیخ الحدیث
۴۱- تذکرہ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب رائپوری ۴۲- بزرگان رائے پور
Beliefs and Pillars of Islam-۴۴ Rules of Raising Funds-۴۳
The Laws Pertaining to Imamat -۴۵
The Rights of Perents and children -۴۶
Guidelines for Sulook and Tareeqat -۴۷
Tasawwuf and tha Elders of Deoband -۴۸
Life Sketch of Hadhrat Thanwi -۴۹
A Biogrophy of the Noblest Nabi -۵۰
My Sheikh and Spiritual Guide -۵۱
Importance of Hijab in Islam -۵۲

ملنے کا پتہ

مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد، سہارنپور (یوپی)
Mob: 09719831058 - 09719639955

جائزہ

کیا ہے ''صدی کی ڈیل''

تنویر آفاقی

ایک عرب تجزیہ نگار عبدالرحمٰن یوسف نے ''صدی کی ڈیل'' کا تعارف اس طرح کرایا ہے: ''اس ڈیل کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت عرب کی کایا پلٹ جائیگی؛ لیکن جو ملت دسیوں سال سے اس حال میں ہو کہ اس پر فوجی انقلابات مسلط ہوتے چلے آرہے ہوں، اس کیلئے حالات کی یہ کایا پلٹ کوئی عجیب بات نہیں ہوگی، اس ڈیل کے بعد ہمیشہ سے قائم چلے آرہے سوالات کے جوابات تبدیل ہوجائیں گے، مثلاً دشمن کون ہے؟ اس کا جواب اسرائیل کے بجائے مزاحمت کرنیوالے فلسطینی قرار پائیں گے جو (فلسطینی مزاحمت کے مقابل) اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہیں، فلسطین کیا ہے؟ اس کا جواب ہوگا، غزہ ساتھ میں سینا کا وہ تھوڑا بہت علاقہ جو اسے میسر آئے گا، اسرائیل کیا ہے؟ اس کا جواب ہوگا وہ علاقہ جسے اسرائیل اپنے لئے پسند کرلے، یعنی ان سوالات کے جوابات صہیونی خواہش کے مطابق بدل دئے جائیں گے''۔

اس کے بعد تجزیہ نگار یوسف لکھتا ہے: ''جس طرح ہمارے (اہل فلسطین) کے حالات بد سے بدترین ہوجائیں گے اور یہ بدترین حالات ان ضمیر فروش عرب حکام کی وجہ سے پیدا ہوں گے، جو دنیا کے نقشے پر اپنے وجود کو باقی رکھنے کی قیمت چکا رہے ہیں''۔

''صدی کی ڈیل'' کے اس مختصر تمہیدی تعارف کے بعد ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کا تعارف مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے، صدی کی ڈیل دراصل فلسطینی قضیئے کو حل کرنے کا ایک منصوبہ ہے جسے امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے پیش کیا ہے، اس منصوبہ کی رو سے فلسطین کی نئے سرے سے حد بندی کر کے جدید فلسطین تشکیل دیا جائے گا جو ''فلسطینی الجدیدۃ'' کے نام سے ہوگا، اس کی جزئیات وتفصیلات کا اعلان اگرچہ اسرائیلی انتخابات کے بعد ہونا تھا؛ لیکن اس کا اعلان آئندہ جون بحرین کے دارالحکومت ''منامہ'' میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں کیا جائے گا، البتہ وقفے وقفے سے اس کی بعض شقیں اب بھی لیک ہوتی رہتی ہیں، جو میڈیا اور عوام کے درمیان بحث وتشویش کا موضوع بنی رہتی ہے، فلسطینی صدر عباس محمود کا خیال ہے کہ یہ منصوبہ دراصل ٹرمپ کے داماد ''کوشنر'' اور شرق اوسط کے ایلچی ''جیسن گرین بلاٹ'' کا تیار کیا ہوا ہے، بلکہ یہ منصوبہ اصلاً اسرائیلی وزیر اعظم نتین یاہو کا تھا، نتین یاہو نے یہ منصوبہ امریکہ کو بیچ دیا ہے اور اب امریکہ اسے فلسطینیوں اور عربوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کی کوشش کررہا ہے۔

''صدی کی ڈیل'' کی مزید تفصیلات اس منصوبے پر گفتگو کا آغاز ۲۰۱۷ء میں ہوگیا تھا، ٹرمپ کے برسر اقتدار آنے کے چند ماہ بعد ہی امریکی اخبارات نے یہ خبر دینی شروع کردی تھی کہ ٹرمپ انتظامیہ کے پاس ''یوشع بن آریہ'' کا ایک منصوبہ ہے، یوشع بن آریہ القدس (یروشلم) کی ہیبر یو (عبرانی) یونیورسٹی کا سابق سربراہ ہے جسے جغرافیہ کے میدان میں خدمات کے لئے اسرائیل ایوارڈ سے نواز چکا ہے، اسرائیلی ڈیفنس فورسز کا میجر جنرل جیورا آئی لینڈ منصوبہ ۲۰۰۴ء بھی امریکہ کے پاس موجود ہے، جس میں

مصر سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ سیناء کے ۶۰۰ رکلومیٹر اسکوائر کے علاقے فلسطینی آبادکاری کے لئے دستبردار ہوجائے، اس کے عوض اسے ۲۰۰ رکلومیٹر اسکوائر کا علاقہ صحراءِ نقب میں دیا جائے گا، اور اقتصادی نوازشیں اس پر مستزاد ہوں گی، اس ڈیل کے سلسلہ میں کچھ باتیں تو وہ ہیں جو بعض سرکاری اہل کاروں کی طرف سے سامنے آتی رہی یا آرہی ہیں، ان میں سے بعض چیزیں اگرچہ ایسی ہیں کہ جب تک اس ڈیل کا پورا نقشہ سامنے نہیں آجاتا، اصل حقیقت واضح ہونا مشکل ہے، کبھی کہا گیا کہ یہ ڈیل کسی فلسطینی حکومت کے قیام کا موقع ہی نہیں رہنے دے گی، کبھی کہا گیا کہ فلسطینی حکومت قائم کرنے کی اجازت ہوگی اور مصر اس کے لئے سیناء میں بعض اراضی فراہم کرے گا، تاہم اب تک سامنے آنے والی باتوں کی روشنی میں چند باتیں جو صاف ہوکر نظر آنے لگی ہیں وہ اس طرح ہیں:

(۱) امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کی طرف سے شہر ''القدس'' کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرلیا جائے گا۔

(۲) اسرائیل، تنظیم آزادی فلسطین اور حماس کے درمیان سہ فریقی معاہدے پر دستخط کرائے جائیں گے اور نئی فلسطینی حکومت قائم کی جائے گی، جس کا نام ''جدید فلسطین'' ہوگا، یہ نئی حکومت مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر مشتمل ہوگی جہاں کوئی یہودی کالونی نہیں ہوگی، قریہ ابودیس جس کو ایک دیوار کے ذریعہ القدس سے جدا کردیا گیا ہے فلسطین کا دارالحکومت ہوگا، شہر القدس کا مشرقی حصہ خالی کرکے اس کے بعض اجزا کو مغربی کنارے میں شامل کردیا جائے گا، بیت المقدس کی تقسیم عمل میں نہیں آئے گی، وہاں اسرائیلی اور فلسطینی دونوں کو اجازت ہوگی، البتہ عرب آبادی کو جدید فلسطین میں منتقل کردیا جائے گا، وہ اسرائیل میں نہیں رہ پائیں گے، شہر القدس کے تمام امور کی ذمہ دار یہودی القدس (یروشلم) میونسپلٹی ہوگی سوائے تعلیم کے، اس کا انتظام جدید فلسطین کے ہاتھ میں ہوگا اور جدید فلسطین ہی یہودی القدس میونسپلٹی کو پراپرٹی، جائیداد اور پانی کا ٹیکس ادا کرے گا۔

(۳) فلسطین فریق کو ان متعدد اسرائیلی کالونیوں کو یہودیوں کے زیر انتظام باقی رکھنے پر اتفاق کرنا ہوگا جن کے بارے میں اقوام متحدہ کا یہ مطالبہ ہے کہ وہاں تعمیر روک دی جائے۔

(۴) مغربی کنارے کو تین علاقوں میں تقسیم کردیا جائے گا، سیاسی اسٹرکچر غزہ میں ہوگا، ابودیس اور القدس کے درمیان ایک پل تعمیر کیا جائے گا جسے عبور کرکے مسلمان مسجد اقصیٰ میں نماز کے لئے آسکیں گے۔

(۵) فلسطینی پناہ گزینوں سے وطن واپسی کا حق چھین لیا جائے گا یعنی انہیں دوبارہ اپنے وطن میں واپس آنے کا حق حاصل نہیں ہوگا، امریکہ کی کوشش یہ ہے کہ فلسطینی پناہ گزینوں کو عرب ممالک بالخصوص اردن اور مصر میں بسایا جائے، اس کے عوض ان دونوں ممالک کو اقتصادی امداد فراہم کی جائے گی، چنانچہ ٹرمپ کے بعض اقدامات سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے، مثلاً امریکہ نے فلسطینیوں کو مدد فراہم کرنے والی ایجنسی ''اونروا'' کو دی جانے والی امداد کی مقدار گھٹا کر نصف کردی ہے۔

''اونروا'' اقوام متحدہ کا ایک ادارہ ہے جو اردن، شام، لبنان مغربی کنارے اور غزہ پٹی میں آباد فلسطینی پناہ گزینوں کی مدد کرتا ہے۔

(۶) جدید فلسطینی حکومت کی تشکیل اور اس کا انفراسٹرکچر کھڑا کرنے کے لئے خلیجی ممالک تقریباً ۱۰ رملین ڈالر پیش کریں گے، مصر جدید فلسطین کو ایک ہوائی اڈہ بنانے، فیکٹریاں قائم کرنے اور تجارتی وزراعتی لین دین کے لئے قطعہ اراضی فراہم کرے گا، اس اراضی میں فلسطینیوں کو رہائش اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی،

غزہ کے اندر ایک ہوائی اڈہ، بحری بندرگاہ قائم کی جائے گی اور اس کے علاوہ فلسطینیوں کی آبادکاری، زراعت، انڈسٹری اور نئے شہر کی تعمیر بھی شامل ہے۔

(۷) یہودیوں کو عربوں کے مکانات خریدنے کی اجازت تو ہوگی لیکن عربوں کو یہودیوں کے مکانات خریدنے کی اجازت نہیں ہوگی، شہر القدس میں دوسرے علاقے شامل نہیں کئے جائیں گے۔

(۸) جدید فلسطین کو اپنی فوج، اپنے ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی، صرف ان ہتھیاروں کو رکھنے کی اجازت ہوگی جو پولیس کے پاس ہوتے ہیں۔

(۹) مصر ''جدید فلسطین'' کو جو اراضی فراہم کرے گا اس میں فلسطینیوں کو آباد ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی، وہ صرف ہوائی اڈے، فیکٹریاں وغیرہ قائم کرنے کیلئے ہوگی۔

(۱۰) اراضی کا حجم اور سائز اور اس کی قیمت وہی ہوگی جس پر فریقین (اسرائیل اور فلسطین) کے درمیان ڈیل کی توثیق کرنے والے ممالک کی وساطت سے اتفاق ہوجائے گا، ڈیل توثیق کرنے والے ممالک سے مراد امریکہ، یورپی اتحاد اور خلیجی ممالک ہیں جو تیل پیدا کرتے ہیں۔

(۱۱) اسرائیل اور جدید فلسطین کے درمیان اس معاہدے پر دستخط اس شرط پر ہوں گے کہ کسی بھی طرح کے خارجی حملوں سے جدید فلسطین کا دفاع اسرائیل کی ذمہ داری ہوگی، بشرطیکہ جدید فلسطین اسرائیل کو اس دفاع کی قیمت ادا کرے، اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان بھی اس بات پر معاملات طے پائیں گے کہ حمایت ودفاع کے بدلے میں عرب ممالک اسرائیل کو کیا قیمت ادا کریں گے۔

حصے داری کی تقسیم:

اس ڈیل کو نافذ کرنے میں امریکہ کی حصہ داری ۲۰ر فیصد کی ہوگی، یوروپی اتحاد کی حصہ داری ۱۰ر فیصد اور تیل پیدا کرنیوالے خلیجی ممالک کی حصہ داری ۷۰ر فیصد ہوگی، خلیجی ممالک کے درمیان ستر فیصد کا یہ تناسب ان کی تیل پیداوار کے تناسب سے تقسیم ہوگا، نئے فلسطین کی تعمیر کی غرض سے اس ڈیل کو نافذ کرنے کے لئے آئندہ پانچ برسوں کے دوران ۳۰ر کروڑ ڈالر خرچ کئے جائیں گے، اس رقم کی فراہمی سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے ذمہ ہوگی۔

ڈیل پر دستخط:

اس پر دستخط کئے جانے کے وقت ہی حماس سے اس کا تمام اسلحہ لیا جائے گا، اس میں حماس کے رہنماؤں کا ذاتی اسلحہ بھی شامل ہوگا، یہ اسلحہ مصریوں کو دیدیا جائے گا، اس کے بدلے میں حماس کے لوگوں کو عرب حکومت کی جانب سے تنخواہیں دی جائے گی، غزہ کی حدود کو عالمی تجارت کے لئے کھول دیا جائے گا، یہ تجارت اسرائیل اور مصر ف کے راستوں سے ہوگی، بحری راستوں سے بھی تجارت کے راستے کھول دیئے جائیں گے، معاہدے پر ایک سال مکمل ہوجانے کے بعد جدید فلسطین میں جمہوری انتخابات کرائے جائیں گے جن میں ہر فلسطینی شہری کو حصہ لینے کا حق حاصل ہوگا، انتخابات پر ایک سال گزر جانے کے بعد بہ تدریج آئندہ تین برسوں کے دوران تمام قیدیوں کو رہا کردیا جائیگا، بحری بندرگاہ اور ہوائی اڈہ بھی جدید فلسطین کے قیام سے پانچ برس کے دوران بنالئے جائیں گے، اس دوران جدید فلسطین اسرائیلی ہوائی اڈہ اور بندرگاہ کا استعمال کرے گا، جدید فلسطین اور اسرائیل کے مابین ایک دوسرے کی سرحدیں عام آمدورفت کے لئے اسی طرح کھلی رہے گی جس طرح دوست ممالک کے لئے کھلی رہتی ہیں، ڈیل کی جو کچھ جزئیات سامنے آئی ہیں ان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ڈیل کا یہ منصوبہ گزشتہ طے پانے والے تمام امن منصوبوں کے برخلاف

ہے، گزشتہ جتنے بھی امن منصوبے طے پائے تھے وہ اس بنیاد پر قائم تھے کہ ایک فلسطینی حکومت قائم ہوگی، جس کا دار الحکومت ۱۹۶۷ کی حدود پر مبنی مشرقی القدس ہوگا، سامنے آنے والی شقوں سے یہ بھی بالکل واضح ہے کہ ڈیل میں یہ بات بھی شامل ہے کہ عرب اور اسرائیل کے مابین تعلقات نارمل ہوجائیں گے؛ بلکہ یہ جزواس ڈیل کا بنیادی رکن ہوگا، اس ڈیل کے تحت آخری سودے بازی اس بات ہوگی کہ اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان امن کے مقصد سے مذاکرات ہوں اور ان مذاکرات کی سربراہی سعودی عرب کرے گا۔

نہ ماننے کا انجام:

اگر حماس اور تنظیم آزادی فلسطین اس ڈیل کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو امریکہ فلسطینیوں کو دی جانے والی تمام امداد کو کالعدم کردے گا اور اس بات کی کوشش کرے گا کہ کوئی دوسرا ملک بھی فلسطینیوں کی مدد نہ کرسکے، اگر تنظیم آزادی فلسطین نے تو ڈیل سے اتفاق کرلیا؛ لیکن حماس اور جہاد اسلامی نے اتفاق نہ کیا تو اس کے انجام کی ذمہ داری ان دونوں تنظیموں کے سر ہوگی اور اسرائیل وحماس کے مابین کسی بھی قسم کے فوج تصادم میں امریکہ اسرائیل کی مدد کرے گا اور حماس اور جہاد اسلامی کی قیادت کو ذاتی طور پر نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا، اس کی وجہ امریکہ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ یہ برداشت نہیں کرے گا کہ ''چند سو لوگ'' لاکھوں افراد کے مستقبل کو اپنے ہاتھ میں لے لیں، اگر اسرائیل ڈیل پر اتفاق سے انکار کرتا ہے تو اس کو ملنے والی اقتصادی مدد بھی روک دی جائے گی۔

ڈیل کے موافق ومخالف ممالک:

اس ڈیل کو متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کی تائید حاصل ہے، بلکہ برطانوی ویب سائٹ مڈل ایسٹ آئی کے مطابق ٹرمپ کے مشیر خاص اور اس ڈیل کے روح رواں جیریڈ کوشنر نے سعودی ولی عہد سے ملاقات کرکے اس ڈیل کی جزئیات سے واقف بھی کرادیا ہے، فلسطینی صدر محمود عباس کو اس ڈیل پر راضی کرنے کی ذمہ داری بھی کوشنر نے سعودی عہد محمد بن سلمان پر ڈالی تھی، گزشتہ نومبر میں محمد بن سلمان نے اس سلسلہ میں محمود عباس سے ملاقات کرکے اسے تسلیم کرلینے کی درخواست کی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمد بن سلمان اس ڈیل کے نفاذ کے سلسلہ میں اتنے پرجوش اس لئے ہیں کہ یہ ڈیل اسرائیل اور سعودی عرب کے درمیان دوستی کی پہلی اینٹ کا کام کرے گی، اسرائیل کی دوستی سعودی عرب کے لئے اس لئے ضروری ہے کہ وہ ایرانی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اسے اپنا ہم نوا بنا سکے، اسی لئے محمد بن سلمان اس ڈیل کو نافذ کرنے کیلئے بڑی سے بڑی رقم لگانے کو تیار ہیں، محمد بن سلمان کا کہنا ہے کہ جب تک فلسطینی مسئلہ حل نہیں ہوجاتا ہم اسرائیل کو اپنے ساتھ ملانے پر قادر نہیں ہوسکتے ہیں'' دوسری طرف ابھی تک ایران اور اردن کے علاوہ کسی بھی ملک کی جانب سے اس طرح کا واضح بیان سامنے نہیں آیا ہے جس میں اس نے اس ڈیل سے عدم اتفاق یا اس کی مخالفت کا عندیہ دیا ہو، ایران نے کہا ہے کہ وہ فلسطین کی مزاحمتی تحریکوں ''حزب اللہ'' اور ''حماس'' کے ساتھ ہیں، روس نے بھی اس سے عدم اتفاق کا اشارہ دیا ہے، دوسرا ملک اردن ہے جس نے علی الاعلان اس ڈیل کو مسترد کردیا ہے، شاہ اردن عبداللہ نے کہا: ''مجھ پر دباؤ ڈالا جارہا ہے؛ لیکن میرے لئے القدس ریڈ لائن ہے، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرے عوام بھی میرے ساتھ ہیں، جو لوگ ہم پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پائیں گے''۔ (بشکریہ ماہنامہ ''ندائے حرم'' احمد آباد)

طب یونانی

موسم سرما کے امراض اور احتیاطی تدابیر

محترمہ ڈاکٹر فرزانہ افضل، بنگلور

موسم سرما کا آغاز اخیر اکتوبر یا ابتدائے نومبر میں ہوتا ہے اور فروری تک رہتا ہے، ان مہینوں میں عموماً شدت کی سردی پڑتی ہے، اگر سردی سے بچاؤ کا اہتمام نہ کیا جائے تو سردی مضر ثابت ہو سکتی ہے، موسم سرما طب وصحت کے حوالے سے جسم انسانی کے لئے مفید ہے، بیمار حضرات کو اس موسم میں علاج کرانا چاہئے، کیونکہ جلد صحت یابی کی توقع ہوتی ہے، سردی سے بچاؤ اور موسم سرما کے امراض سے بچاؤ کے لئے ضروری ہے کہ درج ذیل تدابیر پر عمل کیا جائے۔

غسل:

موسم گرما میں دن میں کئی بار نہایا جاتا ہے؛ لیکن سردی کے باعث عوام غسل کے بارے میں محتاط رہتے ہیں، وہ لوگ جن کی صحت موسمی شدتوں کی متحمل نہیں بلکہ مہینوں نہیں نہاتے سردی کی شدت اور نمونیہ ہونے کا بہانہ بجا مگر زیادہ دن نہ نہانا بھی مضر صحت ہے، مناسب طریقہ تو یہ ہے کہ دن میں ایک غسل آفتابی کریں، اگر وقت نہ ہو یا کوئی امر مانع ہو تو پھر دن میں ایک بار نیم گرم پانی سے غسل کر لیا جائے، غسل ایسی جگہ کریں جہاں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نہ ہوں، اگر جسمانی طور پر کمزوری ہے یا پھر عمر کے سبب جسم میں طاقت نہیں تو ہفتہ میں کم از کم ایک بار ضرور نہایا جائے، غسل کے دوران خون کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، جسم میں فرحت چستی پیدا ہو کر صلاحیت عمل بڑھ جاتی ہے، اگر غسل نہ کیا جائے تو جسم کے اندر گرم غذاؤں کی تاثیر اور مسامات کے بند رہنے سے نہ صرف جلدی عوارض سر اٹھائیں گے بلکہ جسم کی طبعی نشو ونما بھی متاثر ہوگی۔

لباس:

موسم سرما کے آغاز کے ساتھ ہی بتدریج گرم کپڑوں کا استعمال شروع کر دیں، چھوٹے اور شیر خوار بچے چونکہ جسمانی اور طبعی طور پر سبک اور نازک ہوتے ہیں، اس لئے سرد ہوا کا ایک جھونکا بھی انہیں شدید عارضے میں مبتلا کر سکتا ہے، چونکہ اس موسم میں ہوا سرد اور تیز ہوتی ہے، اس لئے ہر شخص اپنی صحت وحالات کے مطابق گرم کپڑوں کا استعمال کرے، گردن، سینے اور پیروں کو سردی سے بچانے کیلئے خصوصی اہتمام کرے، صبح بیدار ہو کر نماز فجر کے بعد کھلے کپڑوں میں ہلکی پھلکی ورزش کو معمول بنایا جائے۔

احتیاطی تدابیر:

صبح وشام سردی کے اوقات میں بلا ضرورت باہر نہ نکلیں، رات چونکہ بہت سرد ہوتی ہے اس لئے کھلے میدان یا بالکل بند کمرے میں نہ سوئیں بلکہ کمرہ میں کھڑکی یا روشن دان ہمیشہ گرم رکھیں، اگر کمزور ہیں اور موسمی شدت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو دھوپ میں بیٹھ کر تلوں کے تیل کی مالش کریں، اگر صحت مند ہیں تو نماز فجر کے بعد ضرورت سے فارغ ہو کر سیر ضرور کریں، اگر یہ نہ کر سکتے ہوں تو صحت کے مطابق کھلی جگہ پر ہلکی ورزش کریں، موسم سرما میں جلد زیادہ متاثر ہوتی ہے، خصوصاً جن دنوں برفانی سردی پڑتی ہے، کیونکہ دیگر اعضاء کپڑوں، جوتوں اور جرابوں میں لپٹے ہوتے ہیں، چہرے کی جلد خشک اور پھٹ جاتی ہے، ان کے لئے گلیسرین لگانا مفید ہے، اگر داغ پڑ جائیں تو نیم گرم پانی سے صابن کے ساتھ دھوئیں۔ (بشکریہ ماہنامہ ''نقوش عالم'' بنگلور)

حضرت زید بن حارثہؓ

آسمان رسالت کا روشن ستارہ

مولانا محمد عمر قاسمی مجاہد پوری

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام میں کچھ امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں، تمام صحابہ کرام میں یہ امتیاز ان ہی کو حاصل ہے کہ ان کا نام قرآن کریم میں مذکور ہے: ”فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡهَا وَطَرًا“۔ (سورۂ احزاب)

یہ اعزاز کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں ہے، اسی طرح آپ کی ایک امتیازی سعادت یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا متبنّٰی (منہ بولا بیٹا) بنایا ہوا تھا اور اس کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے حضرت زید بن حارثہ کے والد (حارثہ) قبیلہ بنو کعب سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی والدہ سعدیٰ بنو معن کے قبیلے سے تھیں، حضرت زید کے لڑکپن کے زمانے میں ان کی والدہ اپنے میکے گئیں تو انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئیں، جاہلیت کا زمانہ تھا اور قبائل عرب کے درمیان جنگیں چلتی ہی رہتی تھیں، حضرت زید کی ننھیال پر ایک دشمن قبیلہ حملہ آور ہوا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق وہ حضرت زید کو قید کر کے لے گیا اور انہیں غلام بنالیا، یہ بے چارے اپنے والدین سے دور غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے، ایک مرتبہ جب عکاظ میں میلہ لگا تو ان کا آقا انہیں اس میلے میں بیچنے کے لئے لایا، اتفاق سے وہاں ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حضرت حکیم بن حزام (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی تھے) تشریف لائے ہوئے تھے، انہوں نے چار سو درہم میں یہ غلام اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ کے لئے خرید لیا، اس کے بعد جب حضرت خدیجہ کا نکاح سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تو انہوں نے حضرت زید بن حارثہ کو بطور غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا اور اب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باقاعدہ غلامی میں آ گئے۔

ادھر حضرت زید کے والد حارثہ اپنے بیٹے کی تلاش میں سرگرداں تھے، اور ان کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا تھا، انہی کی یاد میں انہوں نے یہ شعر بھی کہا کہ: ؎

بکیت علی زید ولم ادر مافعل
احیٌّ فیرجی ام اتی دونہ الاجل

میں زید پر روتا ہوں معلوم نہیں کہ اس کا کیا بنا، پتہ نہیں کہ وہ زندہ ہے کہ کبھی اس سے ملنے کی امید کی جائے، یا اس کو موت آ چکی ہے۔

جب حج کا موسم آیا تو بنو کلب کے کچھ لوگ حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ آئے، وہاں انہوں نے حضرت زید کو دیکھا تو پہچان گئے اور حضرت زید نے بھی انہیں پہچان لیا اور ان سے کہا کہ میرے گھر والوں کو میرا یہ شعر پہنچا دینا: ؎

احن الی قومی وان کنت نائیا
بانی قطین البیت عند المشاعر

یعنی میں اپنی قوم کو اب بھی یاد کرتا ہوں اگرچہ میں دور ہوں اور مقامات مقدسہ کے پاس بیت اللہ کا مجاور بن چکا ہوں۔

یہ لوگ جب واپس پہنچے تو انھوں نے حضرت زید کے والد کو سارا واقعہ سنایا اور حضرت زید کا پتہ بھی بتا دیا، حارثہ اور حضرت زید

کے چچا کعب ان کی تلاش میں مکہ مکرمہ پہنچے پتہ چلا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بنے ہوئے ہیں، وہ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسجد حرام میں تشریف فرما تھے، انہوں نے آکر عرض کیا کہ آپ عبدالمطلب کے بیٹے ہیں، وہ اپنی قوم کے سردار تھے، آپ لوگ حرم کعبہ کے پاسبان ہیں اور آپ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ غلاموں کو آزاد کرتے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ہمارا بیٹا آپ کا غلام ہے ہم اس کے بارے میں آپ سے بات کرنے آئے ہیں، آپ ہم احسان کیجئے جو فدیہ بھی آپ طلب کریں ہم وہ ادا کرنے کے لئے تیار ہیں، انہیں فدیہ لیکر چھوڑ دیجئے۔

آنحضرت صلی اللہ وسلم نے فرمایا یہ تو کچھ مشکل بات نہیں ہے، میں ابھی ان کو بلا لیتا ہوں، ان سے ان کی مرضی معلوم کر لیجئے، اگر وہ آپ کے ساتھ جانا چاہیں تو میں کسی فدیہ کے بغیر انہیں آپ کے حوالہ کر دوں گا، لیکن اگر انہوں نے خود میرے ساتھ ہی رہنا پسند کیا تو جو شخص میرے ساتھ رہنا پسند کرے اسے چھوڑ کر فدیہ لینا مجھ سے نہ ہو سکے گا۔

انہوں نے کہا کہ آپ نے ہماری آدھی سے زیادہ مشکل تو حل کر دی (ان کا خیال تھا کہ حضرت زید یقیناً اپنے باپ اور چچا کے ساتھ جانا پسند کریں گے)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کو بلوا کر ان سے پوچھا کہ ان دونوں کو پہچانتے ہو، حضرت زید نے فرمایا جی ہاں! یہ میرے والد ہیں اور وہ میرے چچا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میرے ساتھ ایک مدت تک رہ چکے ہو اب تمہیں اختیار ہے چاہو تو میرے ساتھ رہو اور چاہو تو ان کے ساتھ رہو۔

حضرت زید نے جواب دیا میں آپ کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، آپ میرے باپ بھی ہیں اور چچا بھی، باپ اور چچا نے یہ سنا تو چیخ پڑے، زید تمہیں کیا ہو گیا تم آزادی پر غلامی کو اور اپنے باپ چچا اور گھر والوں پر ایک اجنبی کو ترجیح دے رہے ہو؟۔

حضرت زید نے جواب دیا، جی ہاں! میں نے ان صاحب کے پاس ایک ایسی چیز دیکھی ہے کہ اس کے بعد ان کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کی یہ گفتگو سنی تو ان کا ہاتھ پکڑ کر حطیم کی طرف لے گئے اور بلند آواز سے فرمایا تمام لوگ گواہ رہیں کہ آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ میرا وارث ہو گا اور میں اس کا وارث۔

شروع میں منہ بولے بیٹے کو وارث بنایا جا سکتا تھا، بعد میں قرآن کریم نے یہ حکم منسوخ فرما دیا، اب کوئی منہ بولا بیٹا وارث نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ بعد میں یہ حکم بھی آ گیا کہ انبیاء علیہم السلام کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔

حضرت زید کے والد اور چچا نے یہ منظر دیکھا تو وہ بھی مطمئن ہو گئے اور خوشدلی سے چلے گئے، اس کے بعد لوگ حضرت زید کو زید بن حارثہ کے بجائے زید بن محمد کہنے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باندی برکہ حبشیہ سے حضرت زید کا نکاح کر دیا تھا جن کی کنیت ام ایمن تھی یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد ماجد کی میراث میں (اور ایک قول کے مطابق والدہ کی میراث میں) ملی تھیں اور یہی وہ خاتون ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد مقام ابواء سے آپ کی چھوٹی سی عمر میں مکہ معظمہ لیکر آئی تھیں، حضرت ام ایمن سے حضرت اسامہ بن زید پیدا ہوئے جنہیں حب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم کا پیارا) کہا جاتا تھا، یہ پورا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت سے سرفراز کئے جانے سے پہلے کا ہے، جب رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی گئی تو جن حضرات نے قبول اسلام کی طرف سبقت کی ان میں حضرت زید بن حارثہ بھی تھے اور ایک قول کے مطابق مردوں میں سب سے پہلے فرد تھے جنہوں نے اسلام کی طرف سبقت کی۔

ایک عرصہ تک حضرت زید کو زید بن محمد ہی کہا جاتا رہا، یہاں تک کہ قرآن کریم میں سورۂ احزاب کی آیت: "ادعـــوهـــم لابائهم هو اقسط عنداللّٰه" نازل ہوئی، پکارو! لے پالکوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے یہی پورا انصاف ہے، یعنی ٹھیک انصاف کی بات یہ ہے کہ ہر شخص کی نسبت اس کے حقیقی باپ کی طرف کی جائے کسی نے لے پالک بنالیا، تو وہ واقعی باپ نہیں بن جاتا، یوں شفقت ومحبت سے کوئی کسی کو مجازا بیٹا یا باپ کہہ کر پکارے وہ دوسری بات ہے۔

حضرت زید بن حارثہ سے حضرت زینب بنت جحش کا نکاح اور طلاق:

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی اپنی پھوپھی زاد بہن سے جو قریش کے اعلی خاندان سے تھیں، حضرت زید بن حارثہ کا نکاح کرنا چاہا، حضرت زید بن حارثہ اصل سے شریف عرب تھے؛ لیکن لڑکپن میں کوئی ظالم ان کو پکڑ کر لایا اور غلام بنا کر مکہ مکرمہ کے بازار میں فروخت کر گیا، بہرحال حضرت زینب کی خاندانی حیثیت چونکہ بہت بلند تھی اور زید بن حارثہ بظاہر داغ غلامی اٹھا کر آزاد ہوئے تھے، اس لئے ان کی نیز ان کے بھائی کی مرضی زید سے نکاح کرنیکی نہیں تھی، لیکن اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو منظور تھا، اس لئے آپ نے زینب اور ان کے بھائی پر زور دیا کہ وہ اس نکاح کو قبول کرلیں، اسی وقت آیت "وما كان لمومن ولا مومنة الخ" نازل ہوئی اور ان لوگوں نے اپنی مرضی کو اللہ ورسول کی مرضی پر قربان کر دیا اور حضرت زینب کا نکاح حضرت زید سے ہوگیا۔

حضرت زینب حضرت زید کے نکاح میں آئیں تو وہ ان کو حقیر لگتا، مزاج میں موافقت نہ ہوئی اور طلاق کی نوبت آ گئی، (چونکہ قرآن کریم کے حکم کے موافق ان کے نام سے اس نسبت عظیمہ (زید بن محمد) کا شرف جدا کرلیا گیا، شاید اس کی تلافی کے لئے تمام صحابہ کے مجمع میں سے صرف ان کو یہ خاص شرف بخشا گیا کہ ان کا نام قرآن کریم میں تصریحا وارد ہوا ہے، یعنی "فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِنها وَطَرًا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی جنگی مہمات کا امیر حضرت زید بن حارثہ کو بنایا اور اس طرح یہ عملی سبق دیا کہ اسلام کی فضیلت کا معیار صرف تقوی ہے، غلامی اور آزادی نہیں یہاں تک کہ آخری بار غزوۂ موتہ کی سربراہی انہیں سونپی گئی اور وہ شخص جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت وصحبت کی خاطر اپنے باپ چچا اور پورے خاندان کو چھوڑ دیا، اللہ کے دین کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلہ پر اس اجنبی سرزمین، بستی مزار (اردن) میں مدفون ہیں، اللہ تعالی ان پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے اور آخرت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب فرمائے۔

محترم قارئین! آپ سبھی حضرات سے گزارش کی جاتی ہے کہ ماہنامہ "نقوش اسلام" کی ایجنسی ہر شہر میں قائم کریں اور "نقوش اسلام" کے فروغ میں حصہ لیں، جو ایک دینی تحریک ہے، کم از کم دس رسالوں سے آپ ایجنسی قائم کر سکتے ہیں۔

نوٹ:
دس ممبر بنانے پر ایک رسالہ مفت بھیجا جائے گا۔ (ادارہ)